مختصر تاریخ کشمیر

اللہ بخش یوسفی

سیکرٹری قائداعظم ایجوکیشنل سوسائٹی

صوبہ سرحد

ناشرین

یوسفی اینڈ یوسفی

تین ہٹی۔ کراچی ۵

طبع ثانی

انتساب

بابائے ملت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ

اور

اُن مجاہدینِ اسلام کے نام

کہ

جنہوں نے حق کی حمایت میں اپنے لختِ جگر اور
خون کے قطرے پیش کرتے ہوئے مظلوم باشندگانِ
کشمیر کو غلامی کی لعنت سے نجات دلا کر آزادی سے ہمکنار
کرانے کی سعی کی۔ ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یوسفی

ب

یادداشتیں

۱

فہرست ابواب

طبع ثانی

کتاب "مختصر تاریخ کشمیر" احباب کے پیہم اصرار سے بڑی عجلت میں مرتب کرانے کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کی گئی تھی۔ اور گو اس وقت عمدہ کاغذ اور سامانِ طباعت مل نہ سکا تھا۔ تاہم یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن جیسا بھی تھا دو ماہ کے مختصر عرصہ میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔

طبع ثانی کے لئے یہ مشکل درپیش رہی کہ انتہائی کوشش کے باوجود مصنف اس پر نظر ثانی نہ کر سکے اور وقت یونہی گذرتا گیا۔ بالآخر اب سرسری نظر ثانی اور مختصر سے اضافہ کے ساتھ یہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ کشمیر سے دلچسپی رکھنے والے احباب اسے حسبِ سابق پسند فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کریں گے ؎

"ناشرین"

پیش لفظ

(آنریبل میاں جعفر شاہ صاحب کاکاخیل وزیر تعلیم حکومت صوبہ سرحد)

میں نے اپنے دیرینہ رفیق کار مسٹر اللہ بخش یوسفی کی تازہ تصنیف "مختصر تاریخ کشمیر" کے مسودہ کو دیکھا۔ افسوس کہ کثرت کار اور انتظامی مصروفیات کی وجہ سے میں اس کا بہ نظر تعمق مطالعہ نہ کر سکا۔ تاہم رفیق موصوف کی سابقہ تصنیفات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حسب عادت تحقیق و تفتیش کو مشعل راہ بنا کر اس مختصر سی کتاب کو مرتب کیا ہو گا۔

مسٹر اللہ بخش یوسفی صوبہ سرحد کے دیرینہ سیاسی کارکنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ سرحد کے دور استبداد میں کئی دفعہ قید و بند کا لطف اٹھا چکے، اور سالہا سال تک آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سیکرٹری منتخب کئے جاتے رہے۔

ضیغم اسلام مولانا شوکت علی کی وفات پر مجلس مرکزیہ خلافت نے انہیں مولانا مرحوم کے جانشین کی حیثیت سے بمبئی میں مقیم رکھا۔

جہاں آپ کو اپنی خدمات کی وجہ سے مسلم لیگ ضلع بمبئی (ای) کا صدر بھی منتخب کر لیا گیا تھا۔

صوبہ سرحد کے میدانِ صحافت میں مسٹر یوسفی نے اُس وقت قدم رکھا جبکہ کسی اخبار کے اجراء کو آگ سے کھیلنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ آپ مجلسِ خلافت اور مسلم لیگ کے کئی اعلےٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ ان کی تصانیف میں " فرانیٹر ٹریجیڈی " جو ہماری مشترکہ سعی کا نتیجہ تھی اور جو بیک وقت ہندوستان اور انگلستان میں شائع ہوئی، تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف نے " تعارف " کے زیرِ عنوان خود اس " مختصر کتاب " کی اشاعت کی وجہ " فوری ضرورت " بیان کر دی ہے۔ ورنہ مجھے تو اُن کے قلم سے کسی ضخیم کتاب کی توقع تھی !

جعفر شاہ

پشاور
۴ر جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

تعارف

کشمیر کے ابتدائی دورِ تاریخ کے متعلق وثوق سے کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ زمانہ قبل از تاریخ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی کوئی ایسی تحریر دکھائی نہیں دیتی کہ جسے اساس و بنیاد قرار دیکر تاریخ کشمیر لکھی جا سکے ہندوؤں کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ اپنے دورِ حکومت کے حالات قلمبند کئے۔ نہ پیشرو اقوام کے حالات معلوم کرنے کے لئے کسی تحقیق و تفتیش کو ضروری سمجھا۔ سنی سنائی کہانیاں اور قصے سینہ بہ سینہ چلتے رہے اور بعد میں جا کر انہی "حقائق و افسانوں" کو تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی جانے لگی۔

ان تاریخی اسناد کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وید کو قدیم ترین کتاب ظاہر کرنے کے بعد ہندو عقائد کے مطابق ہندوستان میں سورج اور چاند کی اولاد یعنی "سورج بنسی" اور "چندر بنسی" دو اقوام حکمران رہیں۔ جن میں سورج بنسی کے پہلے راجہ "اکچھواکو" کو گذرے ہوئے کوئی چالیس لاکھ سال بیان کئے جاتے ہیں۔ اور پھر ہندو مورخین یا افسانہ نگاروں نے بعد میں جا کر یہ تو لکھ دیا کہ "اکچھواکو" سے لے کر راجہ رامچندر تک چھپن ۵۶ حکمران گذرے۔ راجہ رام چندر کی حکومت کا زمانہ

آج سے بہ اختلاف رائے آٹھ لاکھ اور گیارہ لاکھ چھپن ہزار سال قبل بیان کیا لیکن اس کے جواز میں کوئی قابلِ تسلیم سند پیش نہ کی جا سکی۔

اِن حالات میں تاریخِ کشمیر لکھنے کی سعی کرنے والے ہر مورخ کو مشکلات پیش آئیں اور وہ ابتدائی دَور اور ہندو راج کے سلسلہ میں باوثوق ذریعہ سے کچھ لکھ نہ سکا۔ اکثر و بیشتر مورخین نے "راج ترنگنی" کی بنیاد پر عمارت تعمیر کرنا چاہی جو پنڈت کلہن نے بعہدِ راجہ جے سنگھ سمنت ۱۰۷ مطابق ۱۱۴۸ء یعنی آج سے کوئی آٹھ سو سال قبل لکھی تھی۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی اور پنڈت کلہن کی جولانیٔ طبع کا پتہ دیتی ہے۔ اکثر مورخین نے تاریخ کشمیر لکھنے میں اسے اساس و بنیاد قرار دیا۔ لیکن حقیقتاً وہ تاریخی حیثیت سے مبرا اور انہی قصے کہانیوں پر مشتمل ہے جو سینہ بہ سینہ سُنے جاتے رہے۔ انہی "حقائق و افسانوں" کو پنڈت موصوف نے شاعرانہ انداز میں بیان کر دیا۔ اور چند دوسری راج ترنگنیوں کے حوالوں سے کہ جن کا اس وقت کوئی سُراغ نہیں ملتا بعض حکمرانوں کے مسلسل نام بھی درج کر دیئے ہیں۔

عہدِ اسلامی اور اسکے بعد کے واقعات تلاش و جستجو کی جائے تو بالتفصیل معلوم کئے جا سکتے ہیں لیکن اسوقت کشمیر کی مفصل تاریخ لکھنا پیش نظر نہیں۔ اسوجہ سے اس عہد پر بھی سرسری نظر ڈالتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ مقصد صرف اس قدر تھا کہ ان دنوں کہ مسئلہ کشمیر عوام کی توجہ اپنی طرف کئے ہوئے ہے۔ ایک نہایت ہی مختصر سی تاریخ انکے سامنے پیش کر دیجائے۔ ؎ گر قبول اُفتد زہے عزو شرف

یوسفی

ریاست جموں و کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کی سرحدیں ایک طرف چین - روس اور افغانستان سے ملتی ہیں تو دوسری طرف ریاست ہائے چترال - سوات اور صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے بھی ملی ہوئی ہیں - اس کے مغرب جنوب اور جنوب مشرق میں مغربی پنجاب واقع ہے تو مشرقی پنجاب کے کچھ حصہ (ضلع گورداسپور) سے ملحق کرتے ہوئے ریڈکلف کے غیر منصفانہ ثالثی فیصلے نے اس کا تعلق ہندوستان سے پیدا کر رکھا ہے -

ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل اور آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق کوئی چالیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے - جن میں تقریباً ۳۲ لاکھ مسلمان ہیں

ریاست ذیل کے پانچ حصوں میں تقسیم ہے :-

۱- صوبہ سرحد - لداخ - گلگت - بلتستان -

۲- صوبہ کشمیر - اضلاع اننت ناگ یا اسلام آباد - بارہ مولا - مظفر آباد - سری نگر وغیرہ -

۳- صوبہ جموں - اضلاع میرپور - ریاسی جموں - ادھم پور - کٹھوا وغیرہ -

۴- جاگیر پونچھ -

۵- ریاست ہائے ہنزہ اور نگر -

مختصر تاریخ کشمیر

ابتدائی دور

ہندو مورخین تاریخ کشمیر کی ابتداء یوں فرماتے ہیں کہ یہ علاقہ پہلے پہل کلیتہً زیرِ آب تھا۔ اِس جل تھل پر" پروتی جی" کشتی میں سوار ہو کر سیر کو نکلا کرتی تھیں۔ ارد گرد کے علاقہ میں بسنے والی آبادی کو" جال دیو" نامی جن بھوت پریشان کیے رکھتا تھا۔ " پروتی جی" بھی اِس دیو کے ہاتھوں نالاں تھی۔ حسنِ اتفاق سے انہی ایام میں" برہما جی" کا پوتا کسپ سمبارن سے چل کر ہندوستان بھر کے معابد کی یاترا کرنے آیا۔ دورانِ سفر میں اُسے جال دیو کا حال معلوم ہوا۔ تو غصّہ سے بھرپور ہو کر اُس نے اس دیو کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سُلا دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جال بھی بڑا ہشیار تھا۔ جونہی اُسے کسپ کے آنے کی اِطلاع ملی وہ تہ آب ایسا روپوش ہوا کہ ڈھونڈے ہاتھ نہ آیا۔ کسپ کی اس ناکامی کو دیکھتے ہوئے وشنو جی کو مداخلت کرنا پڑی۔ چنانچہ اُس نے ایک پہاڑی کو اُٹھا کر بارہ مولا کی طرف پھینک دیا۔ جس سے اس جل تھل

میں شگاف پیدا ہوا۔ پانی بہ نکلا۔ زمین صاف ہو گئی۔ لیکن اس پر بھی جال پر قابو نہ پایا جا سکا اور وہ اس نشیب میں روپوش ہو گیا۔ بالآخر موقع پا کر پر وتی جی نے اس پر ایک پہاڑ گرا دیا۔ جس کے نیچے جال دیو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سویا پڑا ہے۔ ملک آباد ہونے لگا۔ آبادی بڑھنے لگی اور حکومتیں عالم وجود میں آ گئیں۔

انہی مورخین میں بعض کشپ رشی کو بانی آبادی کشمیر ظاہر کرتے ہیں اور "راج ترنگنی" کا مصنف بھی کشمیر میں کشپ رشی کو ہی بانی آبادی قرار دیتا اور تسلیم کرتا ہے کہ ۱۲۰۰ قبل مسیح تک کشمیر میں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ لیکن اس آبادی کی ابتداء اور اس کے بعد ملکی نظام یا معاشرتی زندگی وغیرہ کے متعلق مطلقاً خاموش رہتے ہیں اور یہ بتانے کی کسی نے تکلیف گوارا نہ کی کہ بالآخر اس وقت ملک کی حالت کیسی تھی۔ اور وہ حالت کب تک قائم رہی۔ اس دور کے حکمرانوں کی کوئی داستان بھی سنائی نہیں دیتی۔ تاہم تکمیلِ داستان کے طور پر پنڈت کلہن نے ناموں کی ایک طویل فہرست درج کرتے ہوئے تاریخ کی کڑیاں منضبط کرنے کی سعئ لاحاصل کی ہے۔ اور کسی بکرماجیت نامی حکمران سے شروع کرتے ہوئے جدھشٹر کے نام تک اکیس[۲۱] راجوں کے نام شمار کر دئے ہیں۔ اور ظاہر کیا ہے کہ یہ راجے ۱۰۲۴ سال تک حکمران رہے۔ پھر ان کے بعد چھ راجاؤں کے نام لکھ کر بتایا ہے کہ انہوں نے ۱۹۲ سال تک حکومت کی اور انہی آخری چھ راجاؤں کے عہد میں سمت بکرمی کا

آغاز ہوا۔

اس دور کا ایک تاریخی واقعہ بیان کرتے ہوئے بعض ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ متذکرہ فہرست کا آخری راجہ جے آندر ۳۷ سال سریر آرائے سلطنت رہا۔ حکومت کے آخری ایام میں اس نے اپنے وزیر کو اس شبہ میں تختۂ دار پر چڑھا دیا کہ وہ حکمران نہ بن بیٹھے۔ اس وزیر کی نعش کو جب ٹھکانے لگانے چلے۔ تو اس کے ماتھے پہ ایک شعر کندہ نظر آیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر حکمران بنے گا۔ کسی برہمن کی نظر جو اس شعر پہ پڑی تو وہ وہیں اسے دوبارہ زندہ دیکھنے کی لو لگائے بیٹھ گیا۔ رات ہوئی تو اس نے دیکھا کہ چند خوبصورت پریاں آئیں اور ان کے آتے ہی وزیر زندہ ہو گیا۔ مجلس عیش و نشاط شروع ہوئی اور صبح تک یہی حالت جاری رہی پو پھٹتے ہی جب پریاں اسے دوبارہ موت کی نیند سلانے لگیں تو برہمن شمشیر لئے دوڑا۔ پریاں ندامت سے بھاگ نکلیں اور وزیر زندہ کا زندہ رہ گیا۔ اس نے کشمیر پر راجہ سندیمان کے نام سے حکومت شروع کر دی اور ۴۷ سال تک حکومت کرنے کے بعد تاج و تخت چھوڑ فقیرانہ زندگی گذارنے لگا۔

انہی مورخین کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً علاقہ کشمیر میں ایسی اقوام آباد تھیں۔ جنہیں درختوں اور سانپوں سے یا تو بڑا اُنس تھا یا ان سے وہ بہت زیادہ خائف تھے۔ کشمیر کے قصے کہانیوں میں بھی سانپوں کی پرستش کے آثار تو اس وقت بھی پرانے کھنڈرات سے

ملتے ہیں۔ اور سانپوں کی پوجا کی تصدیق کشمیر کے اکثر ناموں سے بھی ہوتی ہے مثلاً اسلام آباد کا ابتدائی نام اننت ناگ تھا۔ دریائے جہلم کے منبع کو ویر ناگ کہتے ہیں اور اس قسم کے کئی اور مقامات بھی سانپوں کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہاں برہمنوں نے اپنے قدم جمانے اور پھر وہی سیاہ و سفید کے مالک نظر آنے لگے۔

پھر اشوک کے زمانہ میں جب بدھ مت نے زور پکڑا تو اُن کا ایک تبلیغی مشن ۲۴۵ ق م میں کشمیر پہنچا اور تھوڑے ہی عرصہ میں سرزمین کشمیر پر بدھ مت کا چرچا سنا جانے لگا۔ بدھ مت کے پیرو طاقت پکڑنے لگے۔ حتیٰ کہ سن عیسوی کے اجراء سے کچھ قبل اور اس کے بعد تین تاتاری شہزادے ہشکا۔ جشکا اور کنشکا نے برسرِ اقتدار آکر کشمیر میں بدھ مت کا سکہ جاری کر دیا۔ لیکن برہمن بھی غافل نہ رہے اور انہوں نے ایک بار پھر بدھ مت کے اثر و رسوخ کو ختم کرتے ہوئے ہندو راج قائم کیا۔ رہی اس زمانے کی تاریخی حیثیت تو اس کا اندازہ ذیل کی داستان سے لگایا جا سکتا ہے:۔

بتایا گیا ہے کہ مذکرہ ۱۰۲۴ سال حکومت کرنے والے ابتدائی راجاؤں میں ایک کا نام کنر یا نر تھا۔ اس نے چالیس سال نو ماہ حکومت کی اپنے عہدِ حکومت میں بدھ مت کے کسی پیرو کو اپنی رانی کے عشق میں مبتلا دیکھ کر ایسا بگڑا کہ بدھ والوں کے تمام مندر گرا دئے۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لیں اور مال و متاع برہمنوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسی دوران میں کوئی بساکھی نامی پنڈت پھرتا پھراتا اس طرف آنکلا اور ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا سستانے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دو حسین مہ جبین لڑکیاں چشمہ سے باہر نکلیں۔ پنڈت ان سے ہمکلام ہوا تو پتہ چلا کہ وہ ناگ (سانپ) کی بیٹیاں تھیں۔ انہی کے ذریعہ بساکھی نے ناگ کے درشن کئے۔ دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے۔ ناگ کسی مصیبت میں پھنسا تو پنڈت نے اس کی امداد کی۔ ناگ نے شکریہ کے طور پر ایک لڑکی چندریکھا اس کی نذر کردی۔ دونوں آپس رہنے سہنے لگے۔ ایک دن لیکھا نے غصہ میں آکر زور سے اپنا ہاتھ ایک گھوڑے کی پشت پہ جو مارا تو ہاتھ کا لگنا تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر سنہری نشان بن گیا۔ ملک میں چرچا ہوا۔ راجہ نر نے یہ واقعہ سنا تو غائبانہ عاشق ہوگیا۔ پنڈت اور لیکھا دونوں کو گرفتار کرلینا چاہا۔ لیکن وہ موقع پاکر بھاگ نکلے۔ ناگ نے یہ داستان سنی تو آگ بگولا ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا تمام شہر پر آگ برسانی شروع کردی۔ شہر جل گیا۔ ناگ کی بہن رمنی ناگنی کو اطلاع ہوئی تو غصہ سے بھرپور دوڑی آئی تاکہ پتھروں کی بارش کردے۔ لیکن شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ جو پتھر لائی تھی وہیں پھینک دیئے۔ اس طرح بیس میل تک پتھر ہی پتھر دکھائی دینے لگے۔

کلہن پنڈت اپنی داستان راجہ آدگونند سے شروع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے قبل باون راجے گذرے جن کا حال معلوم نہیں ہوسکا۔ انہی راجاؤں کے متعلق فارسی مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ غالباً

علاقہ جموں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن باون راجاؤں کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ ان میں سے بعض کے نام بلاتحقیق زمانہ حکمرانی دے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً :-

نیلامت پران میں آدگونند۔ دامودر۔ بال گونند اور رانی جیشومتی کا ذکر ہے۔ تاریخ بدمہ مہر میں لو۔ کشی شے۔ کھگندر۔ سورنند۔ گودر سودرن۔ جنک۔ شچی نر۔ اور تاریخ چھول لاکر میں اشوک، جلوک دامودر۔ ہشک۔ ذشک۔ کنشک کا ذکر ہے۔

اس طرح گویا اٹھارہ حکمرانوں کے ناموں کا تو پتہ چل گیا۔ اور باقی ۳۴ کے نام معلوم نہ ہوسکے۔ کہا جاتا ہے کہ آخری راجہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس وجہ سے ایک دوسرے خاندان کے راجہ گونند کو تخت نشین کر دیا گیا۔ پنڈت کلہن کے اندازہ کے مطابق یہ تمام حکمران کشمیر پہ ۱۲۶۶ سال حکومت کرتے رہے۔

غیر مسلم راج کا دوسرا دور

ہندو راج کے دوسرے دور کا آغاز سن بکرمی کے آغاز سے ہوتا ہے
دورِ اول کے آخری راجہ کو سمت بکرمی میں تخت نشین بتایا جاتا ہے
چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس وجہ سے حکومت ایک دوسرے خاندان
میں منتقل ہوگئی۔ دورِ اول کے راجہ گوپادت کی اولاد سے میگواہن نے
۹۱ سمہ بکرمی مطابق ۲۴ سمہ میں عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور
چار پشت تک اس خاندان میں حکومت رہی۔ اور پھر آخری راجہ ہرن کی
جب کوئی اولاد دکھائی نہ دی۔ تو اہلِ کشمیر نے مہاراجہ اوجین سے حکومت
سنبھال لینے کی درخواست کی۔ جس پر راجہ مذکور نے ۱۲۰ سمہ میں ماترگپت
نامی ایک شخص کو گورنر مقرر کر دیا۔ یہ شخص چار سال ۹ ماہ حکومت کرنے
کے بعد تاج وتخت کو چھوڑ کر فقیر بن گیا۔ جس پر راجہ ہرن کے بھائی
کو حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اور اس طرح حکومت پھر سابقہ خاندان
میں عود کر آئی۔

اس دور کے راجاؤں کے متعلق وثوق اور تاریخی اعتبار سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ گو پنڈت کلہن نے ایک طویل فہرست دے کر ان میں بعض کی خوبیاں اور بعض کے نقائص بھی شمار کر دیئے ہیں لیکن بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو ان کی حیثیت قصہ و افسانہ سے زیادہ نہیں۔ جیسا کہ ذیل کے حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہندو مورخین کا خیال ہے کہ رانا دت ۲۴۴ء میں سریر آرائے سلطنت کشمیر ہوا۔ وہ عرصہ دراز سے جس مقصد کے لئے دعائیں مانگ چکا تھا۔ وہ یوں بار آور ہوئیں کہ سمندر کی لہروں سے ایک پری چہرہ لڑکی ملی۔ جسے رانی بنایا گیا۔ پھر تین سو برس حکومت کرنے کے بعد اپنی رانی کو ساتھ لئے ایک غار میں داخل ہو کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ بالا دت ۵۸۶ء میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ اور ۳۵ سال تک سرزمین کشمیر پر حکمران رہا۔

سوء اتفاق سے دربار کے نجومی نے اسے بتایا کہ بادشاہت اس کے خاندان سے نکل کر اس کے داماد کے قبضہ میں جانے کو تھی۔ راجہ حیران و پریشان ہوا۔ اس آنے والی مصیبت کا علاج سوچا جانے لگا۔ بالآخر بڑی سوچ بچار کے بعد اپنی لڑکی کی شادی ایک بہت ہی غریب شخص سے کر دی تاکہ وہ خاندانی وجاہت کے فقدان کی وجہ سے تاج و تخت کے دعوے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ شادی کے بعد لڑکی اپنے خاوند کی خاندانی پستی کی

وجہ سے مطمئن نہ رہ سکی اور اس نے وزیر دربار سے راہ ورسم بڑھالی۔ وزیر بھی فریفتہ دشیدا ہوگیا۔ اور خیر اسی میں دیکھی کہ راجہ کے داماد کی خوب آؤ بھگت کی جائے۔ چنانچہ اس غریب پر انعام واکرام کی بارش ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ عوام میں بھی ہر دلعزیز ہوگیا۔ اور جب راجہ نے آخری سانس لی۔ تو داماد نے تاج اپنے سر پر رکھتے ہوئے کشمیر پہ حکمرانی شروع کر دی۔

ایک اور اسی قسم کا "تاریخی" قصہ بیان کیا گیا ہے کہ راجہ درلبک کے ہاں کسی سوداگر مہمان نے ایک شب قیام کیا۔ شاہانہ انتظام تھا۔ لیکن صبح ہوئی تو سوداگر نے شکایت کی کہ رات کو شمع کے دھوئیں سے اسکے سر میں درد ہوگیا تھا۔ راجہ اس کی طبع نازک کا یہ حال سن کر بہت حیران ہوا۔ چند دنوں کے بعد راجہ نے عمداً اس سوداگر کے گھر کا رُخ کیا۔ وہاں شب باش ہوا تو سوداگر نے جواہرات اس طرح چن دیئے۔ کہ ان کی روشنی سے مکان جگمگا اٹھا۔ اسی دوران میں راجہ کی نگاہ سوداگر کی حسین وجمیل بیوی پر پڑی۔ تو محبت کو چھپائے چھپا نہ سکا۔ لیکن غرور سلطنت نے سوال کی اجازت نہ دی۔ سوداگر تاڑ گیا۔ اُس نے راجہ کو ناراض نہ کرنا چاہا۔ اور رقاصہ کے لباس میں اپنی بیوی نذر کر دی۔

انہی جواہرات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جب راجہ پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگھم پر پہنچا تو اُس نے ایک لعل کو دریا میں ڈال دیا۔ جس سے دریا کا پانی پایاب ہوگیا۔ راجہ اور اُس کے ساتھی دریا سے پار اُتر گئے۔ پھر لعل کو اٹھایا تو پانی اپنی اصلی حالت میں بہنا شروع ہوگیا۔

اسی طرح کے ایک اور کارنامہ میں بتایا گیا ہے کہ نکتا پیڈیا ملتا دت نامی راجہ ۱۷۱۹ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ۳۶ برس حکومت کی اور اس دوران میں قنوج۔ بنگال۔ بہار۔ دکن۔ اوجین اور دہلی کو فتح کرنے کے بعد اس نے سیلون۔ اس کے اردگرد کے جزائر کابل۔ بخارا۔ کاشغر۔ ترکستان۔ تبت۔ چین اور سائبیریا کے علاقے بھی اپنے زیر نگین کر لئے۔ اس کی موت بھی ایک معمہ سے کم نہ تھی۔ کسی کا قول ہے کہ وہ زندہ ہی دیوتاؤں سے جا ملا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ فتح کے شوق میں سفر کرتے ہوئے برف کے نیچے دب کر مر گیا اور بعض کا کہنا ہے کہ کسی خاص شرمندگی کی وجہ سے اس نے خودکشی کرلی تھی۔

اس قسم کے حالات کے بعد ہندو راجگان کا یہ دورِ سلطنت ۱۳۴۰ء تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

عہدِ اسلامی کا آغاز

مسلمان چوتھی صدی ہجری تک پنجاب پہنچ چکے تھے۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے کشمیر کا بھی رُخ کیا ہو۔ اس طرح کشمیر آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی کے وسط تک ہندوؤں ہی کے زیرِ نگین رہا۔ سلطان محمود غزنوی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے لشکر نے انند پال والئے لاہور کے تعاقب میں کشمیر کے کچھ حصہ کو روند ڈالا تھا۔ لیکن وہ اس علاقہ میں اپنی کوئی ایسی قابلِ ذکر یادگار نہیں چھوڑ گئے کہ جس سے ان کے جسمانی یا روحانی اثر و رسوخ کا پتہ چل سکے۔ ان دنوں کشمیر پر دیدہ رانی ایک ہندو عورت حکمران تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود نے حسبِ عادت عورت کا مقابلہ پسند نہ کیا۔ دوئم راجہ مذکور نے رانی موصوفہ کے پاس پناہ لینے کی بجائے پہاڑیوں میں پناہ لی۔ اس وجہ سے سلطان نے مزید پیش قدمی یا ملک پر قبضہ کرنے کو پسند نہ کیا اور واپس لوٹ گیا۔

کشمیر میں اسلام کے اولین مبلغ و داعی تبت کی جانب سے آنے والے بزرگ عبدالرحمٰن عرف بلال نامی تھے۔ مشہور ہے کہ اُن کے کندھے پر ہر وقت ایک پالتو بُلبُل بیٹھا رہتا تھا۔ اس وجہ سے وہ "بُلبُل شاہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور کشمیر میں اس وقت تک خاص عزت و وقعت سے دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت بلال راجہ سہدیو کے زمانہ میں وارد کشمیر ہوئے۔ کئی ایک مسلمان اُن کے ہمرکاب تھے اور رفتہ رفتہ اور مسلمان بھی کشمیر میں دکھائی دینے لگے۔

اسی دوران میں تبت سے ریچن نامی شہزادہ اپنی مشکلات اور دشمنوں سے تنگ آکر کشمیر کی طرف بھاگ آیا۔ راجہ سہدیو کو علم ہوا تو اس نے ریچن کو اپنے پاس ٹھہرایا۔ شہزادوں کی طرح پرورش کی اور اُسی شاہی ماحول میں وہ پروان چڑھنے لگا۔

راجہ سہدیو کے زمانہ میں کشمیر پر ترکوں نے حملہ کر دیا۔ راجہ نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن جنگجو ترکوں کے مقابل نبرد آزما ہونا آسان بات نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ بھاگ نکلا۔ ملک پر ترکوں نے قبضہ کیا۔ انہی کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن وہ کوئی آٹھ ماہ بھی حکومت کرنے نہ پائے تھے کہ ملک میں قحط پڑا اور ایسا شدید قحط کہ راعی رعایا کو اپنے حال پر چھوڑ خود بھاگ نکلے۔ ملک میں کسی کی حکومت باقی نہ رہی۔ ریچن نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فہم و فراست کو کام میں لاتے ہوئے اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سہدیو کے وزیر رام چند نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ ریچن نے بلا خوف مخالفت حکمران بن کر راجہ سہدیو کی بیوی کوٹہ سے عقد باندھ لیا۔

مبلغ اسلام حضرت عبدالرحمٰن عرف بلال المشہور "بلبل شاہ" ۷۱۵ھ مطابق ۱۳۱۵ء میں وارد کشمیر ہوئے تھے۔ انہوں نے سرزمین کشمیر پر قدم رکھتے ہی اپنے فیض روحانی سے ملنے والوں کو فیضیاب کرنا شروع کر دیا اور ایسی شہرت حاصل کی کہ خود ریچن کو بھی اُن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ریچن گو خود بدھ مت کا پیرو تھا۔ تاہم وہ حضرت بلال کے فیض روحانی سے فیضیاب ہونے لگا۔ حتیٰ کہ تاج و تخت سنبھالنے کے کوئی ایک ہی سال بعد مشرف بہ اسلام ہو کر سلطان صدرالدین کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ کشمیر کا اولین مسلم حکمران تھا۔ عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور کوئی تین سال حکمران رہنے کے بعد ۱۳۲۳ء میں ہمیشہ کے لئے اس جہان سے چل بسا۔ بیٹا نابالغ تھا۔ اس وجہ سے عنان سلطنت رانی کوٹہ کے ہاتھ لگی۔ جس نے اپنے پہلے خاوند سہدیو کے بھائی اودیان دیو کو سریر آرائے سلطنت کر دیا۔ اس طرح کشمیر میں اولین اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو کر پھر ہندو راج شروع ہوا۔ اور کوئی پندرہ سال تک قائم رہا۔

کشمیر میں سلطنت اسلامی کا آغاز بالکل غیر متوقع اور اچانک ہوا۔ ایک درویش باخدا کے فیض روحانی سے ریچن نے بدھ مت کو خیرباد کہتے ہوئے اسلام قبول کیا۔ قدرت اُسے پہلے ہی سلطنت عطا کر چکی تھی۔ ہادی اور

روحانی دونوں طاقتیں تبلیغ اسلام کے لئے وقف ہوگئیں۔ عوام کے دلوں پر صداقت اسلام کے نقوش نظر آنے لگے۔ مسلمانوں کو دربار شاہی تک رسائی حاصل ہوگئی اور چونکہ تعداد میں بہت زیادہ نہ تھے اس وجہ سے فرداً فرداً ہر شخص خاص عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

ہندوؤں کا اپنی سلطنت کو یوں اچانک مسلمانوں کے قبضہ میں جاتے دیکھ کر پریشان ہو جانا فطری امر تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ حکمران اور دوسرے مسلمانوں کا حسن سلوک عوام کو اپنا گرویدہ بنا چکا تھا۔ کسی پر جبر نہ تھا۔ تبدیلی عقاید کے معاملہ میں کوئی سختی نہ تھی۔ ایک صداقت تھی جو خود بخود اپنی جگہ پیدا کئے جا رہی تھی۔ ایسی حالت میں جب سلطان کو دست اجل نے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ اس دنیا سے چل بسا تو پھر سابقہ ہندو حکمران خاندان کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ حکومت کے تمام اعلے عہدوں پر ہندو قابض تھے۔ اس وجہ سے دوبارہ سلطنت قائم کر لینے میں انہیں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اس طرح سلطنت اسلامی اپنے دور میں ہی بھی نہ تھی کہ مٹا دی گئی۔ لیکن صداقت اسلام کی جڑیں اتنی مضبوطی سے لگ چکی تھیں کہ پندرہ سال کے بعد پھر نشو و نما پانا شروع ہوئیں۔

عہدِ اسلامی کا پہلا دور

سلطان صدرالدین کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو شاہی دربار تک رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ مسلمان اپنے آپ کو حکمران سے وابستہ سمجھتے ہوئے ترقی کے میدان میں گامزن ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں گرد و نواح سے کافی تعداد میں مسلمان کشمیر کی طرف کوچ کر آئے۔ انہی نوواردوں میں شاہ میر ابنِ طاہر نیت سے وارد کشمیر ہوا۔ اور آتے ہی اس نے اپنی قابلیت و تدبر سے شاہی دربار تک رسائی حاصل کر لی اور پھر جلد ہی کرسیٔ وزارت پر متمکن نظر آنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ابنِ طاہر نے عوام کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ چنانچہ صدرالدین کی وفات کے بعد جب ایک دفعہ پھر ہندو راج قائم ہوا تو رانی کوٹہ یا اودیان دیو کو اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ ابنِ طاہر کو مسندِ وزارت سے علیحدہ کر سکتے۔

ابنِ طاہر فرائضِ وزارت سرانجام دیتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اختلافات بڑھنے شروع ہوئے۔ راجہ بھی طاقت پکڑ گیا۔ کثرت آبادی ہندوؤں پہ

مشتمل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال بعد ابن طاہر کو نہ صرف یہ کہ کرسیٔ وزارت سے ہٹا دیا گیا بلکہ اس کا دربار میں داخلہ بھی بند ہوا۔ گویا اب اُسے دربار شاہی سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ابن طاہر جیسا مسلمان یہ ذلت کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس ذلت آمیز سلوک کو دیکھتے ہوئے مقابلہ پر اُتر آیا۔ راجہ نے مقابلہ کی ٹھانی لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ عوام کے دل ابن طاہر کے ساتھ تھے۔ راجہ کی فوج کے کئی دستے میدانِ جنگ میں ابن طاہر سے آملے۔ راجہ نے جو یہ حالت دیکھی تو جان بچانے کی فکر میں بھاگ نکلا۔ ابن طاہر نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ رانی کوٹہ نے مقابلہ کی تیاری کی لیکن ابن طاہر نے عورت سے جنگ لڑنا پسند نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چھ ماہ تک بعض علاقوں پر ابن طاہر اور بعض علاقوں پر رانی کا تسلط رہا۔ رانی نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگایا۔ وہ یہ نہ سمجھی کہ حکومت اسے ابن طاہر کی شرافت کے صدقہ میں ملی تھی۔ بلکہ اُس نے اسے اپنی قوت کا انعام خیال کیا۔ بالآخر تنگ آکر ابن طاہر نے چھ ماہ بعد رانی کو قید میں ڈال دیا۔ اور خود ۱۳۵۹ء میں سلطان شمس الدین کے نام سے فرمانروائی شروع کر دی اور چونکہ اس کے بعد عرصہ دراز تک کشمیر پر مسلمان حکمران رہے۔ اس وجہ سے سلطان صدر الدین کی بجائے سلطان شمس الدین کو ہی کشمیر کا اوّلین مسلمان حکمران کہا جاتا ہے۔

سلطان جمشید | سلطان شمس الدین تین سال پانچ دن حکومت کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے اس جہان سے چل بسا۔

جمشید اور علاؤالدین دو بیٹے باقی رہے۔ جن میں اوّل الذکر نے سنہ ۱۳۴۲ء میں تختِ کشمیر کو زینت بخشی۔ لیکن ۱۴ ماہ بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا کہ خود اپنے بھائی کا مقابلہ کرتے ہوئے اونتی پور کے مقام پر مارا گیا۔

سلطان علاؤالدین

بھائی کے مارے جانے پر سلطان علاؤالدین علی میر نے سنہ ۱۳۴۳ء میں عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ کوئی تیرہ سال تک کامیاب حکمران کی حیثیت سے اس نے ملک پر اپنا تسلط جمائے رکھا۔ اپنے عہدِ حکومت میں کئی آبادیاں کیں۔ پُل بنوائے اور عوام کو امن و چین پہنچانے کے ذرائع پر اکثر غور و فکر کرتا رہا۔

سلطان شہاب الدین

سلطان علاؤالدین علی میر کی وفات پر اس کا فرزندِ اکبر سلطان شہاب الدین سنہ ۱۳۵۴ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اسے ملک کو وسعت دینے کی فکر ہر وقت پریشان رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی تبت کاشغر اور بدخشاں کی طرف یورشیں جاری کیں اور اُنیس سال تک کامیاب اور نیک نام حکمران رہنے کے بعد وفات پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطان کے عہد میں پنڈتوں نے کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر دکھائی دینے لگے۔

سلطان قطب الدین

سلطان شہاب الدین کی وفات کے بعد سلطان قطب الدین تختِ کشمیر پر جلوہ گر نظر آیا۔ اس کے عہد میں مشہور بزرگ حضرت سید علی ہمدانی واردِ کشمیر ہوئے۔

جنہوں نے اپنے فیضِ روحانی سے کشمیر کی کایا پلٹ دی۔ سلطان ۵ سال حکمران رہنے کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

سلطان سکندر

قطب الدین کے بعد اس کے بیٹے سلطان سکندر نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ کشمیر کے مسلمان حکمرانوں میں یہ بادشاہ بہت ہی اولو العزم۔ بہادر، جفاکش اور قابل خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں حضرت سیّد علی ہمدانی کے فرزند حضرت سید محمدؒ واردِ کشمیر ہوئے۔ تو بڑی تعداد میں مسلمان ان کے ہمرکاب داخل کشمیر ہو کر یہیں آباد ہو گئے۔ سلطان سکندر حضرت سیّد علی ہمدانی کا حلقہ بگوش اور اُنہیں کے پند و نصائح پر عمل پیرا رہا۔ کشمیر میں باقاعدہ تبلیغ اسلام اسی عہد میں ہوئی۔ اس طرح کچھ ان مبلغین کی وجہ سے اور کچھ خود بادشاہ کے حسنِ اخلاق سے ہزاروں غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

سلطان کو فنِ تعمیر سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک ہندو مورخ کے قول کے مطابق اس نے ایک مسجد بنوائی تھی۔ جس میں ۳۷۲ ستون چوبی کلاں اور ۳۲ ستون چوبی خورد تھے۔ اس سلطان کے عہد میں حضرت سید علی ہمدانی نے وفات پائی تو ان کا شاندار مزار تعمیر کرایا۔

انہی ایام میں امیر تیمور گورگانی ہندوستان پر یورش کر چکا تھا۔ اور یہ امر بعید از قیاس نہ تھا کہ کشمیر بھی اس کے پاؤں تلے روندا جائے لیکن سلطان سکندر کے حسنِ اخلاق اور بطریق احسن حکمرانی کی تعریف سن کر امیر تیمور نے سلطان کو پیغامِ مبارکباد کے ساتھ تحائف بھیجے جن

میں دو ہاتھی بھی تھے۔ سلطان سکندر نے بھی کشمیر کے نایاب تحائف امیر تیمور کی خدمت میں پیش کئے۔
سلطان سکندر نے ۲۴ برس تک حکومت کرنے کے بعد ۱۴۱۶ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔

سلطان علی شاہ

سلطان علی شاہ نے بھی اپنے والد سلطان سکندر کی طرح پوری قابلیت سے فرائض حکمرانی سرانجام دیئے۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کشمیر کے غیر مسلم برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے سازشیں شروع کر دیں۔ اگرچہ اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ سلطان علی شاہ کوئی سات سال حکومت کرنے کے بعد ۱۴۲۲ء میں وفات پا گیا۔

سلطان زین العابدین

۱۴۲۲ء میں سلطان زین العابدین نے عنانِ سلطنت سنبھالی۔ اسے ملک آباد کرنے کی فکر تھی۔ چنانچہ تمام دوسرے امور سے بے پرواہ ہو کر وہ ہمہ تن تعمیر کی طرف لگ گیا۔ کہیں شہر آباد کئے۔ کہیں سڑکیں بنوائیں۔ کہیں پل تعمیر کرائے۔ سرینگر شہر کی توسیع ہوئی۔ بمقام نوشہرہ ایک محل تعمیر کرایا۔ جس کی بارہ چھتیں اور ہر ہر چھت پر پچاس پچاس کمرے بیان کئے جاتے ہیں۔ سلطان زین العابدین نڈر اور بہادر تھا۔ علم و ادب سے بھی اُسے کافی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کئی کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ دور دور

سے کاریگر منگوائے ۔ کاغذ سازی ۔ شال بافی ۔ پیپر ماشی اور لکڑی کے کام کو اس کے عہد میں ترقی نصیب ہوئی۔

سلطان زین العابدین کے عہد میں فارسی نے کشمیر میں خوب نشو و نما پائی ۔ کشمیری پنڈتوں نے دربار تک رسائی حاصل کرنے کے لئے فارسی تعلیم حاصل کی ۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ اور سلطان پر اپنا اثر جمانے میں کامیاب ہوگئے ۔ اب پنڈت سلطان کے گرد جمع نظر آنے لگے اور پھر ایک ہندو حکیم کے علاج سے صحت یاب ہونے پر ہندوؤں پر انعام واکرام کی ایسی بارش شروع ہوئی کہ ہندوؤں نے اُسے " بڈشاہ " یعنی بڑا بادشاہ یا شہنشاہ کہنا شروع کیا ۔ تو بعض مسلمان اسے " بہ شاہ " بمعنی ہندوؤں کا بادشاہ کہنے لگے ۔

سلطان زین العابدین کوئی پچاس برس حکومت کرنے کے بعد اپنے بیٹے کے لئے تخت و تاج چھوڑتے ہوئے آرام کی نیند سو گیا ۔

سلطان حیدر

سلطان حیدر نے ۱۴۷۲ء میں تخت کشمیر کو زینت بخشی ۔ سلطان زین العابدین نے برہمنوں سے مشفقانہ سلوک کیا تھا ۔ اس کا بدلہ انہوں نے سازشوں اور فتنہ و فساد سے دیا ۔ لیکن سلطان ایسا کمزور نہ تھا ۔ اس نے سختی سے مقابلہ کرتے ہوئے ان سب منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ۔ لیکن ابھی ایک سال بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا کہ اپنے محل سے گر کر فرشتۂ اجل کو لبیک کہہ گیا ۔

سلطان حسن

۱۴۹۲ء میں سلطان حسن کو تختِ کشمیر پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ لیکن افسوس کہ یہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی بجائے عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اسے راگ و رنگ سے فرصت نہ ملی۔ موسیقی کا دور دورہ شروع ہوا۔ گانے والے اور گانے والیوں کی کوئی کمی نہ رہی۔ طوائفوں نے کشمیر کا رخ کیا اور دربار تک پہنچنے کے لئے راگ و رنگ کو ہی وصف سمجھا جانے لگا۔ ملک میں ابتری پھیل گئی۔ کوئی نظام نہ رہا۔ ہندو جو پہلے ہی سازشوں پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، موقع سے فائدہ اٹھانے لگے اور انہی سازشوں کے تحت شاہی مسجد تک نذرِ آتش ہوئی۔

اسی عہد میں ایران سے شمس الدین، حکمرانِ کشمیر کے لئے تحائف لے کر آیا۔ اور کوئی آٹھ برس تک کشمیر میں مقیم رہا۔ اس کے قیام سے کشمیر میں فرقہ پرستی کی تعلیم کو تقویت ملی۔

سلطان گیارہ سال حکمران رہنے کے بعد اس جہان سے چل بسا۔

سلطان محمد شاہ، فتح شاہ

سلطان محمد شاہ کوئی سات سال کی عمر میں فرمانروا بنایا گیا۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے اس وقت کے سادات نے جو دربار میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے، عملاً حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ محمد شاہ برائے نام بادشاہ بنا رہا۔

اس دوران میں سلطان زین العابدین کے ایک پوتے نے جو علاقہ کوہستان نوشہرہ میں حاکم تھا۔ لشکر کشی کر دی۔ سلطان محمد شاہ کے لئے جو ۱۵۰۳ء میں

تخت نشین ہوا تھا۔ دو سال سات ماہ حکمران رہنے کے بعد بھاگ کھڑے ہونے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس پر فتح شاہ بادشاہ بن گیا۔ طرفین میں کشمکش جاری رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ تین دفعہ محمد شاہ تخت نشین ہوا اور تین دفعہ بھاگ نکلا۔ لیکن آخری بار جب سلطنت سنبھال چکا تھا کہ اپنے ہی ایک معتمد ملک کاجی چک نے اسے گرفتار کرتے ہوئے ۱۵۳۳ء میں ابراہیم کو سریر آرائے سلطنت کر دیا۔

سلطان ابراہیم

۱۵۳۳ء میں سلطان ابراہیم نے تخت پر قدم رکھتے ہی کاجی چک کو اپنا وزیر بنایا۔ فتح شاہ کے لڑکے نازک شاہ نے مخالفت کی۔ جنگ ہوئی۔ کاجی چک بھاگ نکلا۔ تو ابراہیم اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور پانچ سال کی حکومت کے بعد میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔

نازک شاہ

۱۵۳۸ء میں نازک شاہ نے حکومت سنبھالی۔ لیکن حکومت حقیقتاً ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی کہ جو اُسے تخت پہ لانے کا باعث تھے۔ بادشاہ ان کی مرضی و رائے کے بغیر کوئی حرکت نہ کر سکا۔ چنانچہ کوئی ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ ان لوگوں نے نازک شاہ کو اُتار کر ابراہیم کے بیٹے مبارک شاہ کو تخت پر بیٹھا دیا۔

مبارک شاہ

۱۵۳۹ء میں مبارک شاہ تخت پہ بیٹھایا گیا۔ لیکن اب حکومت کا نظام کلیتہً بگڑ چکا تھا۔ کوئی مضبوط ہاتھ اسے سنبھالنے والا نہ تھا۔ درباریوں کی طاقت یا گروہ بندی ہی بادشاہ پر

کو شطرنج کے مُہروں کی طرح حرکت دے رہی تھی۔ ملک میں ابتری پھیل گئی۔
ادھر انہی ایام میں شیر شاہ سے شکست کھا کر ہمایوں پریشان پھر رہا تھا۔
کہ اُس کے ایک معتمد حیدر مرزا نے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔

حیدر مرزا

حیدر مرزا نے بغیر کسی دقت کے کشمیر کو فتح کر لیا ملک میں ابتری اور طوائف الملوکی تو تھی ہی اسے اپنی سلطنت قائم کر لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ وہ مسلسل دس سال تک اس خطہ ارض پر حکمران رہا۔ لیکن ۱۵۵۱ء میں رات کے وقت جنگ میں مارا گیا۔

مُبارک شاہ

حیدر مرزا کے مارے جانے پر مبارک کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن حکومت عملاً اور کلیتہً چک قوم کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ دولت چک نے حسب ضرورت مُبارک کو تخت سے اُتار کر اُس کے دوسرے بھائی ابراہیم ثانی کو بادشاہ بنا دیا۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اُسے بھی تخت سے اتار کر اندھا کر دیا گیا۔
اس کشمکش میں کوئی پانچ سال گذر گئے۔

اسماعیل

۱۵۵۶ء میں اس کے دوسرے بھائی اسماعیل کو تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ چکوں کی طاقت سے واقف تھا۔ صرف برائے نام بادشاہ رہنے پر مطمئن ہو گیا جس پہ اُسے دو سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔

حبیب

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا حبیب تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی باپ کی حکمت عملی پہ عمل کیا۔ تو کوئی تین

سال تک اس کے نام سے سکہ چلتا تھا۔ لیکن اس کے بعد غازی چک کے ہاتھوں قید ہو کر تخت سے دست بردار ہوا۔

غازی چک

جیب کو قید کر لینے کے بعد غازی چک نے خود اپنے نام سے حکومت شروع کر دی۔ اس طرح ایک جدید خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔ لیکن کوئی دو سال بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا کہ ۱۵۶۳ء میں مرضِ جذام میں مبتلا ہو جانے پر تخت سے دستبردار ہو گیا۔

حسین شاہ

ملک میں ابھی تک بدامنی اور طوائف الملوکی کا زور تھا۔ غازی چک کے دست بردار ہونے پر اس کے بھائی حسین شاہ نے تاج و تخت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اُسے بھی مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے دوسرے بھائی علی شاہ کے لئے تخت خالی کر دے۔

علی شاہ

علی شاہ نے ۱۵۶۹ء میں زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس دوران میں دربارِ دہلی کو بھی کشمیر کی طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ مُلّا اسحاق اور قاضی صدر الدین بطور نمائندگانِ حکومتِ دہلی ۱۵۷۲ء میں واردِ کشمیر ہوئے۔ اِن دنوں ہندوستان میں اکبرِ اعظم کا طوطی بول رہا تھا۔ ان سفراء نے مطالبہ کیا کہ خطبۂ جمعہ میں اکبر کا نام پڑھا جایا کرے۔ علی شاہ نے بہ امرِ مجبوری اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا۔

دربارِ دہلی کے سفراء سے فراغت ہوئی تو راجہ بہادر سنگھ نے جو کشتواڑ میں حاکم تھا علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ علی شاہ نے مقابلہ کیا۔ راجہ کو شکست ہوئی اس نے سالانہ خراج دینے کے اقرار کے ساتھ ہی اپنی بہن کو حرم علی شاہ میں داخل کر دیا۔ ادھر راجہ بہادر سنگھ کی بہن حرم شاہی میں داخل ہو رہی تھی کہ ادھر دربار دہلی کے ایما پر علی شاہ کی دختر کا عقد اکبر کے فرزند سلیم سے کر دیا گیا۔ علی شاہ نے حکومت سنبھال لی۔ لیکن نو سال سے زائد حکمران نہ رہ سکا اور گھوڑے سے گر کر جان بحق ہوا۔

یوسف چک

باپ کی وفات پر ۹۸۶ھ میں یوسف چک نے عنانِ سلطنت سنبھالنا چاہی۔ لیکن علی شاہ کی لاش ابھی بے گور و کفن پڑی تھی کہ علی شاہ کے بھائی نے حملہ کر دیا۔ مگر وہ ابتدائی حملہ ہی میں خود کام آیا۔ یوسف چک نے حکمرانی شروع کی۔ اور کوئی چالیس دن کی حکمرانی کے بعد سید مبارک کے ہاتھوں شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

سید مبارک

سید مبارک نے عنانِ سلطنت سنبھالی تو چک خاندان کے دربار دہلی سے تعلقات کو دیکھتے ہوئے بعض امراء نے یوسف چک کو خفیہ خط لکھنے شروع کیے۔ اور اسے ترغیب دی جاتی رہی کہ وہ سید مبارک پر حملہ کر دے۔ چنانچہ یوسف چک لشکر جمع کرتے ہوئے حملہ آور ہوا۔ لیکن تابِ مقابلہ نہ لا کر دوبارہ بھاگ نکلا۔ اس طرح سید مبارک کو آٹھ ماہ دس دن تک

حکومت کرنا نصیب ہوئی۔

لوہر شاہ

۱۵۸۰ء میں لوہر شاہ نے تخت کشمیر کو زینت بخشی۔ بڑی دانائی سے حالات پر قابو پانے اور معاملات کو سلجھانے میں کامیاب رہا۔ تو ایک دفعہ پھر کشمیر میں باقاعدہ حکومت دکھائی دینے لگی۔ امن وامان کا دور دورہ شروع ہوا۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال نظر آنے لگے۔ لیکن بہ ایں ہمہ بعض لوگ سازشوں میں مصروف رہے۔ انہوں نے شکست خوردہ یوسف چک کو پھر اکسایا۔ اس نے دربار دہلی سے امداد طلب کی۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پنجاب سے لشکر جمع کرتے ہوئے کشمیر پر حملہ آور ہو گیا۔ لوہر شاہ کو شکست ہوئی تو یوسف چک کو پھر کشمیر پر حکمرانی کا موقع ملا۔

یوسف چک

لوہر شاہ کو شکست دینے کے بعد ۱۵۸۰ء میں یوسف چک دوبارہ فرمانروائے کشمیر بنا۔ لیکن ملک پر کسی قابلیت سے حکومت کرنے کی بجائے اس نے اپنے مخالفین کو کچلنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مخالفت بڑھ گئی۔ اور حکومت جم نہ سکی۔ حیدر چک نے جو دہلی میں مقیم تھا، ان واقعات سے فائدہ اٹھایا۔ دہلی دربار میں وہ کافی اثر ورسوخ حاصل کر چکا تھا۔ وہاں سے چل کر اس نے لشکر کشی کرتے ہوئے نوشہرہ اور بھمبر پر قبضہ جما لیا۔ یوسف چک کی کچھ تو غلط پالیسی کی وجہ سے ملک میں عام مخالفت تھی اور کچھ عیش وعشرت میں پھنس جانے کی وجہ سے وہ کسی کام کا نہ رہا۔

اسی غفلت میں پڑا تھا کہ دربار دہلی سے طاہر خان شاہی فرمان لے کر پہنچا کہ یوسف چک نے تخت کشمیر پہ بیٹھنے کے بعد دربار دہلی کو کوئی اطلاع کیوں نہ دی۔ یوسف سمجھ گیا کہ یہ مداخلت کا بہانہ ہے۔ اس وجہ سے اس نے اپنے بیٹے حیدر چک کو تحائف دے کر دہلی بھیجدیا۔ جہاں وہ پورے ایک سال تک مقیم رہا۔ دوسرے سال دوسرے بیٹے یعقوب چک کو تحائف دے کر دہلی کی طرف روانہ کیا جو تین سال تک دہلی میں مقیم رہا۔

اس کے بعد دربار دہلی سے یوسف چک کو بہ نفسِ نفیس دہلی پہنچنے کا حکم ملا۔ لیکن وہ تعمیل سے قاصر رہا۔ شاہ دہلی اس عدم تعمیل کو برداشت نہ کر سکا اور راجہ بھگوانداس کی قیادت میں کشمیر پر حملہ کرنے کو لشکر روانہ کر دیا۔ یوسف نے مقابلہ کیا۔ لیکن شاہی لشکر کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اور خیر اسی میں دیکھی کہ اپنے آپ کو راجہ بھگوانداس کے حوالے کر دیا۔

یعقوب چک یوسف چک ۹۸۶ھ میں شکست کھا کر راجہ بھگوانداس کے پنجہ میں پھنس گیا۔ لیکن یعقوب چک مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ اس نے کشمیر پہ حکمرانی شروع کر دی۔ لیکن اس کا تخت پہ بیٹھنا تھا کہ پرانی رقابتیں اور مخالفتیں عود کر آئیں۔ جنگ و جدل کا میدان گرم ہوا۔ اس باہمی خانہ جنگی میں سوپر سے لے کر کامراج تک کا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل کر شمس چک کے ہاتھ لگا۔ ملک میں بیک وقت دو حکمران نظر آنے لگے۔ عوام مصائب و آلام کا شکار ہوئے۔ اسی دوران میں بعض اشخاص دہلی پہنچے اور انہوں نے شہنشاہ

اکبر سے درخواست کی کہ وہ کشمیر پہ اپنا تسلط جمالے۔ دربار میں ان لوگوں کی شنوائی ہوئی تو قاسم خان کی سرکردگی میں تسخیر کشمیر کو لشکر روانہ کر دیا گیا۔ یعقوب چک مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن عوام ایسے نالاں تھے کہ یعقوب کو قبل از وقت ہی اپنی شکست نظر آنے لگی۔ چنانچہ وہ بلا مقابلہ ہی بھاگ گیا۔ شمس چک نے مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اور میدان قاسم خان کے ہاتھ رہا۔

عہدِ اسلامی کا دوسرا دور

حکومتِ مغلیہ

اکبرِ اعظم

۱۵۸۶ء میں یعقوب اور شمس کو شکست دینے کے بعد دربار دہلی کے نمائندہ کی حیثیت سے قاسم خان نے ملک پر قبضہ جما یا۔ مگر جلد ہی یعقوب اور شمس دوبارہ لشکر لئے مقابلہ پر اتر آئے۔ انہیں بار دوئم پھر شکست ہوئی۔ تو ۱۵۸۶ء میں قاسم خان نے کشمیر پر مغلیہ خاندان کا پرچم لہرایا۔

۱۵۸۷ء کے بعد کشمیر سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس کی قدرتی خوبصورتی۔ اس کے فطری مناظر اور اس کی آب و ہوا نے خاندان مغلیہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ حتیٰ کہ خود اکبر اعظم نے تین بار کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ یہاں باغات لگوائے۔ پل بنوائے اور اس خوبصورت خطۂ ارض کی

خوبصورتی میں ہر ممکن اضافہ کرنے کی سعی کی۔ نظامِ حکومت کو چلانے کے لئے گورنر مقرر کئے جن کے نام یہ ہیں :۔

قاسم خان۔ یوسف خان۔ محمد قلی خان اور مرزا یادگار۔

اس دوران یعنی ۹۹۶ھ ۱۵۹۰ء میں حضرت سرورِ کونین صلے اللہ علیہ وسلّم کے موئے مبارک کشمیر پہنچائے گئے۔ اور یہ مقدس امانت مسجد حضرت بل میں محفوظ کی گئی۔ تبّت کا علاقہ بھی انہی ایّام میں شاملِ کشمیر کیا گیا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر اکبرِ اعظم کی وفات کے بعد ان کے فرزند شہزادہ سلیم نے ۱۶۰۵ء میں جہانگیر کے نام سے سلطنت شروع کی۔ نظام میں کوئی ردّ و بدل نہ ہُوا۔ کشمیر حسبِ سابق صوبہ سلطنتِ دہلی رہا۔ جہانگیر نے بھی تین دفعہ کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بہت سے نئے باغ لگوائے گئے۔ عدل و انصاف کا دَور شروع ہوا۔ اس دوران میں مرزا علی اکبر۔ ہاشم خان۔ صفدر خان۔ احمد بیگ دلاور خان۔ ارادت خان اور اعتقاد خان نے فرائضِ صوبیداری انجام دیئے۔

کہا جاتا ہے کہ احمد بیگ کے زمانہ میں چالیس روز تک آندھی چلتی رہی۔ اور دلاور کے زمانہ میں ایسی آگ لگی کہ ہزاروں مکان جل گئے۔ جہانگیر کشمیر سے واپسی پر راستہ میں ہی ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء مطابق ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو وفات پا گیا۔

شاہجہان ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات پر شاہجہان نے عنانِ سلطنت سنبھالی اور اپنے بزرگوں کے

نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کشمیر پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ کوئی چار دفعہ کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ باغات کو وسعت دی۔ سڑکیں اور پُل بنوائے اور نظم ونسق میں ایسی اصلاحات جاری کیں کہ جن سے عوام پُرامن زندگی بسر کرنے لگے۔ شاہجہان کا عہد، عہدِ امن وچین تھا۔ شاہ نے سیاحوں کے لئے سرائیں تعمیر کرائیں۔ دُور دراز سے پھل دار درخت منگوا کر جگہ جگہ باغ لگوائے۔ عدل وانصاف کا دَور دورہ تھا اور اپنا ایک مشہور حکم پتھر پر کندہ کرا کر جامع مسجد کے دروازے پر نصب کر دیا۔ جو عوام کی بہت سی قانونی اور رواجی تکلیفات کے سدِّ باب کا باعث بنا۔

عہدِ شاہجہان میں ذیل کے صوبیدار مقرر ہوئے:۔

خواجہ ابوالحسن۔ ظفر خان۔ علی مردان۔ شربت خان۔ ظفر خان ثانی۔ مرادبخش حسن بیگ۔ مراد خان اور لشکر خان۔

اورنگ زیب عالمگیر

شاہجہان کے بعد ۱۶۵۸ء میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے تختِ دہلی کو زینت بخشی۔ تاریخ ہند وکشمیر میں عالمگیر بہت ہی اولوالعزم۔ بہادر اور صاحبِ تدبر حکمران سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ عالمگیری میں حق وانصاف کا دَور دورہ تھا۔ بادشاہ خود اتنا متقی وپرہیزگار کہ اپنی گذر اوقات کے لئے بھی محنت مزدوری سے پیسہ پیدا کرتا رہا۔ اس نے شاہی خزانہ پر بوجھ بننا پسند نہ کیا۔ عالمگیر کے عہد میں غیر مسلم بڑے بڑے عہدوں پر متمکن تھے۔ لیکن ان تمام اوصاف حمیدہ کے ہوتے ہوئے شاہ کی سخت گیری اور مخالفین بالخصوص ہنود سے نبرد آزمائی

دشمنانِ ملت کی نظر میں خار کی طرح کھٹکتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم مورخین نے عالمگیر کی تمام خوبیوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اُسے بدنام کرنے کو ہزاروں من گھڑت افسانوں سے تاریخِ ہند کے صفحے سیاہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

کشمیر میں جوں کی توں حکومت چلتی رہی۔ شاہجہان کے نافذ کردہ احکام پر بدستور عمل ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ عالمگیر نے رعایا کے آرام و آسائش کے لئے مزید اقدامات کئے۔ ہندو، مسلمانوں سے یکساں سلوک کیا جاتا رہا۔ بڑے بڑے عہدوں پر ہندو متمکن تھے۔ جن میں چودھری شنکر مہیش خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ملک کے باغات کو وسعت دی گئی۔ مزید سڑکیں تعمیر ہوئیں اور صنعت و حرفت کی طرف شاہ نے خاص توجہ دی۔ حتیٰ کہ صنعتی اعتبار سے کشمیر دُنیا میں ایک قابلِ رشک خطۂ ارض بن گیا۔ اور اس عہد کی تیار شدہ شالیں شال بافی میں ترقی کی انتہا سمجھی جاتی ہیں۔

برنیر (BURNAR) نامی ایک یورپین سیاح نے اسی عہدِ عالمگیری میں کشمیر کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہ باغات سے بہت متاثر ہوا اور اپنے تاثرات میں ملک کی حالت، امن کے دور دورہ اور حق و انصاف کی تعریف کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں صنعتِ کشمیر اپنے اوجِ کمال پر نظر آئی۔ اور شال بافی کی صنعت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ذیل کے گورنر کشمیر میں فرائضِ صوبیداری سرانجام دیتے رہے :-

ابراہیم خان - اسلام خان - سیف خان - بازرخان - سیف خان (دوسری بار) افتخار خان - قوام الدین - ابراہیم خان (دوسری بار) حفیظ اللہ خان - ابوالفتح خان - ابوالنصر خان - بہرام خان - نوازش خان -

اورنگ زیب عالمگیر نے ۲۷ رفروری ۱۷۰۷ء میں بمقام احمد نگر وفات پائی۔

بہادر شاہ

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء میں اس کا بیٹا شہزادہ بہادر شاہ، شاہ عالم کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ملک کی حالت بگڑنا شروع ہوئی۔ جس فتنہ کو عالمگیر نے دبا رکھا تھا وہ سر اٹھانے لگا۔ کشمیر میں جعفر خان حاکم ہوا تو وہ عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اس دنیا سے چل بسا۔ پھر عارف خان نے اس کی جگہ لی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد علی مردان خان کو جو نظامت کابل و پشاور سے معزول کیا جا چکا تھا۔ گورنر کشمیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس کی وفات پر نوازش خان بار دوئم حاکم مقرر ہوا۔ اور آخر میں یہ عہدہ عنایت اللہ خان کے ہاتھ لگا۔

جہاندار شاہ

بہادر شاہ شاہ عالم اول کی وفات پر ۱۷۱۲ء میں عنانِ سلطنت جہاندار شاہ کے ہاتھ لگی۔ لیکن وہ کوئی ایک سال بھی حکمرانی کرنے نہ پایا تھا کہ چچا زاد بھائی فرخ سیر نے بنگال سے لشکر کشی کرتے ہوئے اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا۔

سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار

۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک فرخ سیر کا دورِ حکومت چلتا رہا۔ لیکن وہ

خود اپنے دوستوں کی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ ۱۷۱۹ء میں یکے بعد دیگرے عنان سلطنت اس کے چچازاد بھائی رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کے ہاتھ لگی۔ اس کے بعد دوسرے چچا زاد بھائی محمد شاہ نے تخت دہلی پر قبضہ کرتے ہوئے ۱۷۴۸ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے احمد شاہ نے ۱۷۵۴ء تک اپنا سکہ چلایا۔ لیکن ۱۷۵۴ء میں جہاندار شاہ کے بیٹے عالمگیر ثانی نے اقتدار حاصل کر لیا تو ۱۷۵۹ء تک اس کا طوطی بولتا رہا۔ پھر اس کے بیٹے شاہ عالم ثانی نے ۱۸۰۶ء تک۔ پھر اس کے بیٹے اکبر شاہ نے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اور آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ اپنا رعب وجلال قائم نہ رکھ سکی۔ مخالف اسلام طاقتیں ایک ایک کر کے نمودار ہونے لگیں اور خاندان مذکور میں کوئی ایسا قابل حکمران تخت نشین نہ ہو سکا۔ جو معاملات ملکی کو بہ طریق احسن سنبھال سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہونے لگی۔ کشمیر پر خاندان مغلیہ کی سیادت تو بلاشبہ بہت عرصہ تک قائم رہی لیکن حکومت واقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ کہ جو دربار دہلی سے سند صوبیداری لیکر کشمیر پہنچ جایا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں نے اپنی مرضی ورائے سے حکومت کرنا شروع کی۔ وہ اپنے آپ کو مالک وحکمران سمجھتے رہے۔ اپنی من مانی کارروائیوں میں مطلقاً آزاد تھے۔ انہیں مرکز سے کسی قسم باز پرس یا سرزنش کا خطرہ درپیش نہ تھا۔ ان

حالات ہیں عملاً کشمیر سے مغل اقتدار اُٹھ گیا۔ اور یہ علاقہ برائے نام "صوبہ دربار دہلی" سمجھا جاتا رہا۔ اور سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ ثانی ابھی دو سال بھی حکومت کرنے نہ پایا تھا کہ کشمیر سلطنتِ دہلی سے کٹ کر دُرّانی خاندان کے زیرِ نگین نظر آنے لگا۔

تاجدارانِ سلطنت مغلیہ کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ کشمیر کے قدرتی مناظر نے انہیں اپنا والا و شیدا بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قدرتی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ اور اہلیانِ کشمیر کو امن و چین پہنچانے میں کوئی کسر باقی رہنے نہ دی۔

چنانچہ اسی عہد کے متعلق خود ایک غیر مسلم کشمیری پریم ناتھ اپنی کتاب "انسائڈ انڈیا" میں یوں اظہارِ خیال کرتا ہے :-

"جہاں تک ان کے بس میں تھا مغلوں نے ملک میں امن و چین کو دوبارہ رائج کر دیا۔ اکبر نے ہری پربت کے گرد دیوار بنائی۔ جہانگیر اور شاہجہان اس وادی کے والا و شیدا تھے۔ انہوں نے متعدد بار اس علاقہ کا سفر کیا۔ انہوں نے شاہی محل بنائے۔ عیش و نشاط کے لئے عمدہ باغات لگائے اور ملک کے طول و عرض میں چنار کے درخت نصب کر دیئے۔ ڈل لیک کے ارد گرد کے باغات ان کے اعلےٰ کام کے زندہ نمونے ہیں۔"

عہدِ اسلامی کا تیسرا دور

حکومتِ افاغنہ

ادھر سلطنتِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو رہا تھا۔ ادھر نادر شاہ
نے افغانستان سے چلکر ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر یلغار کر دی۔ ملک
کو روند ڈالا۔ فخر الدولہ گورنر کشمیر نے جب ملک میں یوں ابتری دیکھی تو
اس ڈر سے کہ کہیں نادر شاہ اپنا رُخ کشمیر کی طرف نہ پھیر دے۔ کشمیر
سے چل کر لاہور میں قدمبوسی کو حاضر ہوا۔ اور اپنی قابلیت۔ تدبّر اور
حکمتِ عملی کے صدقہ میں نادر شاہ سے سندِ حکمرانی حاصل کرتے ہوئے
واپس کشمیر پہنچا اور نادر شاہ کے نمائندہ کی حیثیت سے حکومت
شروع کر دی۔ اس طرح دورِ مغلیہ کا خاتمہ ہو کر کشمیر میں ایک
جدید دور کا آغاز ہوا۔

لیکن بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ نادر شاہ نے شاہِ دہلی کو اکی

سلطنت واپس دینے کا اعلان کیا۔ جس سے فخر الدولہ کو پریشانی ہوئی۔ دربار دہلی کے طرفداروں نے پھر سر اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فخر الدولہ کشمیر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دربار دہلی میں اتنی سکت یا طاقت باقی نہ تھی۔ کہ وہ کشمیر پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکتا۔ اس وجہ سے مقامی طور پر دربارِ دہلی کے طرفدار اور مخالفین نے آپس میں خانہ جنگی شروع کر دی۔ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہوا تو کبھی دوسرے کا۔ اس کش مکش میں ملک اور اہلِ ملک کو شدید نقصان پہنچا۔ اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ نظر آنے لگا۔

احمد شاہ ابدالی

اس بد امنی کی حالت میں عصمت خان اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ احمد شاہ دُرانی نادر شاہ کے بعد سریر آرائے سلطنت تھا۔ ۱۷۵۱ء میں عصمت خان کی حاضری پر اُسے گورنر کشمیر مقرر کر دیا۔ لیکن ملک کے حالات کو قابو میں لے آنا، اب کسی تیسری طاقت کا کام تھا اور اہلِ کشمیر کی قسمت میں ابھی امن و چین نہ تھا نہیں۔ جنگ و جدل۔ کنبہ پروری۔ دوست نوازی اور رشوت کا بازار گرم رہا۔ احمد شاہ کو اپنی حکومت سنبھالنے سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ وہ کشمیر کی طرف متوجہ ہو سکتا۔ نہ اُسے عیش و عشرت سے لگاؤ تھا، نہ سیر و تفریح کے لئے وقت مل سکا۔ یہی وجہ ہے کشمیر کی حالت سُدھر نہ سکی۔ البتہ متعصب مورخین کے لئے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس دورِ افاغنہ میں جبکہ پوری طرح امن و امان بھی میسر نہ تھا ہندوؤں کو کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا جاتا رہا۔ جن میں راجہ سکھ جیون دیو خاص طور پر

قابلِ ذکر ہے۔ جسے دربارِ ابدالی سے ساٹھ ہزار خروار شالی سالانہ ملتی تھی۔ جو نسلاً بعد نسلاً ملتی رہی اور سکھوں کے عہد میں جا کر بند ہوئی۔

تیمور شاہ

احمد شاہ ابدالی کے بعد ۱۷۷۳ء میں تیمور شاہ تختِ کابل پہ جلوہ گر ہوا۔ اس کے عہد میں بھی یکے بعد دیگرے کئی گورنر یا صوبیدار مقرر ہوئے۔ ملک کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا۔ بارکزئی قبیلہ کے کئی افراد کو کشمیر پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اور کوئی سترہ سال بلا کسی واقعہ کے گذر گئے۔

شاہ زمان

۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کے بیٹے شاہ زمان نے عنانِ سلطنتِ افاغنہ اپنے ہاتھ میں لی، ملک کے اندرونی معاملات میں اصلاح ہوئی۔ شاہ زمان نے اپنے والد تیمور شاہ کے مقابل کشمیر کی طرف زیادہ توجہ دی اور ایک دو گورنروں کو معزول کیا۔ دوسرے افسروں کو بھی سزائیں دیں۔ اس طرح ملک میں امن قائم ہوگیا اور پونچھ کے علاقہ کو باقاعدہ زیرِ تسلط بھی کر لیا گیا۔

اس عہد میں بھی ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جاتا رہا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دیوان انند رام کا نام خاص طور قابلِ ذکر ہے۔

محمود شاہ دُرانی

شاہ زمان کے بعد ۱۸۰۱ء میں شاہ شجاع نے عنانِ سلطنت سنبھالی۔ لیکن جلد ہی اُسے ملک بدر ہونا پڑا۔ جس پر محمود شاہ دُرانی تختِ کابل پہ جلوہ گر ہوا۔ اس کے عہد میں بھی کئی گورنر مقرر و برطرف ہوئے۔ سکھ اُس وقت پنجاب میں اپنا تسلط جما رہے تھے۔ ملک کی اندرونی

حالت کسی طرح تسلی بخش نہ تھی ۔ اس پر کشمیری ہندوؤں نے سازشیں شروع کردیں۔ کیونکہ انہیں پنجاب میں ایک ہندو حکومت بنتی نظر آرہی تھی۔

انہی سازشوں کے تحت سکھوں نے ۱۸۱۴ء میں کشمیر پر حملہ کر دیا لیکن افغان گورنر اور اس کی فوج نے سکھوں کو مار بھگایا ۔ اس وقت سکھوں کی امیدیں بر نہ آئیں اور احمد شاہ ابدالی کا خاندان بدستور کشمیر پر حکمران رہا۔

سکھوں کا عہدِ حکومت

سنہ ۱۸۱۹ سے سنہ ۱۸۴۶ تک

سنہ ۱۸۱۴ء کی شکست کے بعد بھی سکھ ہر وقت کشمیر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ کشمیری پنڈت جن کی سازشوں کا نتیجہ سکھوں کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا۔ برابر و مسلسل اپنی شرارتوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہر وقت اور ہر موقع پر سکھوں کو اُکسایا۔ تاکہ وہ اپنے داغِ شکست کو کسی نہ کسی طرح دھو ڈالیں چنانچہ انہی حالات میں پنڈتوں کا ایک وفد بہ سرکردگی پنڈت بیربل ڈار بھیس بدل کر کشمیر سے عازم لاہور ہوا۔ تاکہ خود راجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُسے کشمیر پر قبضہ کر لینے کی درخواست کرے۔ کشمیر کے صاف دل مسلمان ان پنڈتوں کو مصیبت زدہ سمجھ کر اپنے گھروں میں پناہ دیتے رہے اور اُنہیں یہ وہم و گمان

بھی نہ تھا کہ یہی لوگ حقیقتاً" مسلمانوں کی بیخ کنی کا مقصد لیکر روانہ ہو چکے تھے۔

ان کشمیری پنڈتوں کے اُکسانے اور ۱۸۱۴ء کا داغ شکست دھونے کی خاطر راجہ رنجیت سنگھ نے اپنی تمام تر طاقت کو جمع کرتے ہوئے ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر حملہ کر دیا۔ راجہ گلاب سنگھ اس لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ جبار خان گورنر کشمیر خود مقابلہ کے لئے نکلا۔ کشمیر میں شاہی لشکر بہت قلیل تعداد میں تھا۔ کشمیری پنڈت اپنی چالاکیوں اور دولت کے زور سے فضا کو خراب کئے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جبار خان اور اس کے بہادر ساتھی میدان میں کام آئے۔ کمک پہنچ نہ سکی۔ اس طرح کشمیر درانیوں کے تسلط سے نکل کر "سکھا شاہی" کے تحت آ گیا۔ اور دیوان موتی رام پہلا گورنر کشمیر مقرر ہوا۔

کشمیر پر سکھوں نے ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک حکومت کی۔ ایسی حالت میں کہ "سکھا شاہی" "ظلم" کے مترادف سمجھی جاتی ہو۔ اس دور کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی تفصیل دینا مضمون کی طوالت کا باعث بنے گا۔ بدیں وجہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس وقت کے ایک غیر جانبدار یورپین سیاح ولیم مورکرافٹ (WILLIAM MOORCRAFT) کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے کہ جس نے ۱۸۲۴ء میں کشمیر کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے :-

" سکھ، کشمیریوں کو مویشیوں سے کسی طرح بہتر نہ سمجھتے تھے اگر کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کر دے تو اس کی سزا سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ تھی۔ جس میں سے چار روپے مقتول کے ورثاء کو

دئے جاتے تھے اگر وہ ہندو ہو۔ اور دو روپے دئے جاتے تھے اگر وہ مسلمان ہو۔"

مسٹر مورکرافٹ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ کشمیری ہر قسم جبر و ستم کا شکار ہو رہے تھے، لکھتے ہیں:

"قابلِ کاشت اراضی کا سولھواں حصہ بھی کاشت نہ کیا جا رہا تھا۔ اور بھاری بھرکم ٹیکسوں کی وجہ سے ہر طرف دیہات اُجاڑ اور جھونپڑیاں غیر آباد نظر آ رہی تھیں۔"

کشمیر پر حکومت کرنے کے لئے خالصہ دربار کی جانب سے جو گورنر مقرر ہوتے رہے، ان میں آخری دو مسلمان تھے۔ ایک شیخ غلام محی الدین اور دوسرے شیخ مذکور کے بیٹے شیخ امام الدین۔

ڈوگرہ راج کا ابتدائی دور

اس وقت کے سرزمین پنجاب پر راجہ رنجیت سنگھ کا طوطی بول رہا تھا۔ علاقہ جموں کی پہاڑیوں سے گلاب سنگھ۔ دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ نامی ڈوگروں نے ۱۸۱۲ء میں خالصہ دربار کی ملازمت اختیار کی۔ یہ تینوں علاقہ جموں کے رئیس رنجیت دیو کے برادر زادوں کی اولاد سے تھے۔ جب ۱۸۱۰ء میں رنجیت دیو کے انتقال کے بعد وراثت کے جھگڑے کھڑے ہوئے تو اس باہمی کشمکش نے سکھ دربار کو جموں اور اس کے اردگرد کی پہاڑیوں پر اپنی سیادت قائم کرنے کا موقع دیا۔ گلاب سنگھ۔ دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ نے بڑی وفاداری سے خدمات سرانجام دیں اور خالصہ دربار کو ایسا گرویدہ بنایا کہ اس نے ۱۸۱۰ء میں گلاب سنگھ کو جموں۔ دھیان سنگھ کو بھمبر، چبل اور پونچھ اور سوچیت سنگھ کو رام نگر کی سرداری عطا کر دی۔ دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ ۱۸۴۳ء میں قتل کر دیے گئے۔ ان کی جائداد پر ورثاء کا قبضہ ہوا۔ لیکن دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کے انتقال پہ خالصہ دربار نے ۱۸۴۴ء

میں اس کی سرداری ضبط کرلی۔

کشمیر پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں خالصہ دربار کے لیئے گلاب سنگھ کی خدمات بہت ہی مفید ثابت ہوئیں جن کے پیش نظر راجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر فتح ہونے پر اُسے راجہ کے خطاب سے جموّں کے علاقہ کی عنانِ سلطنت یا صوبیداری عطا کردی۔

گلاب سنگھ نے اب اپنے پاؤں جمانے شروع کیئے اور جب پنجاب میں خالصہ دربار کی حالت خراب ہونے لگی تو اُسے سکھوں کی قسمت سنبھالنے کی دعوت دی گئی۔ گلاب سنگھ چاہتا تو اُس وقت پوری سکھ قوم کی قیادت اپنے قبضۂ قدرت میں لاسکتا تھا۔ لیکن اُس کی دُور بین نگاہوں نے خالصہ دربار کی بنیادوں کو متزلزل دیکھتے ہوئے اس بار کو اُٹھانے کی بجائے اپنے لئے خُدا ریاست پیدا کرنے کی فکر کی اور جموّں کے اردگرد کے علاقہ پر ہر ممکن طریقہ سے قبضہ کر لیا۔ بایں ہمہ اُس نے خالصہ دربار کی دعوت کو بھی کلیتہً مسترد نہ کیا اور ۱۸۴۵ء میں جبکہ خالصہ دربار آخری ہچکیاں لے رہا تھا وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ قبول کرلیا۔

گلاب سنگھ اگر سکھ قوم کا وفادار ہوتا تو خالصہ دربار کو بچا لینے میں بہت کچھ کرسکتا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں اپنی حکومت بنانے کا نشہ گھوم رہا تھا۔ اُس نے انگریزوں سے سازباز شروع کردی اور خالصہ دربار کو کمزور کرنے میں اپنی زندگی کا راز مضمر پایا۔ چنانچہ مشہور انگریز مورخ کننگھم (CUNNINGHAM) لکھتا ہے :۔

"وزارتِ عظمیٰ کو سنبھالنے کی دعوت ملنے سے قبل ہی گلاب سنگھ انگریز حکام سے سانٹھ بانٹھ کر رہا تھا۔"

اور لارڈ ایلن برو (LORD E. BUROUGH) نے ۲۰ فروری ۱۸۴۴ء کو ملکہ انگلستان کے نام ذیل کے الفاظ میں اطلاع بھیجی:-

"پہاڑیوں میں راجہ گلاب سنگھ اپنی جابرانہ عادت کے مطابق دوسروں کے حقوق یا اُس حکومت کے اقتدار کو کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے کہ جس کے وہ زیرِ تسلط سمجھا جاتا ہے، اپنی طاقت کو بڑھائے جا رہا ہے۔"

پھر کوئی ایک سال بعد ۲۰ فروری ۱۸۴۵ء کو لارڈ ہارڈنگ (LORD HARDINGE) نے اپنے ایک مکتوب میں یوں اظہارِ خیال کیا:-

"گلاب سنگھ نے ہمیں پھر لکھا ہے کہ وہ معاہدہ کر لینے میں مسرت محسوس کرے گا..... اب راجہ لکھتا ہے کہ ہمیں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے۔"

ان واقعات کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ گلاب سنگھ سکھوں کی حمایت میں انگریزوں سے جنگ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ "تاریخ سکھاں" میں اس حقیقت کو یوں بے نقاب کیا گیا ہے:-

"انگریزوں نے راجہ گلاب سنگھ کو اطلاع دے دی تھی کہ وہ لاہور میں سکھوں کی آزاد حکومت کو فوج کے منتشر ہو جانے پر تسلیم کر لیں گے۔ لیکن راجہ نے ظاہر کر دیا کہ فوجیوں سے نبٹ لینا

اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ بہرحال طرفین میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہو گیا کہ انگریز لشکر سکھّوں پر حملہ کرے اور جب سکھ شکست کھا جائیں تو حکومت انہیں اعلانیہ منتشر کر دے۔ ستلج کا راستہ بلا مقابلہ طے ہوا اور ان جدید آنے والوں کے لئے دارالسلطنت کی سڑک کھلی چھوڑ دی جائے۔ ان حالات اور شرمناک پالیسی اور غدّاری کے تحت "سوبراؤں" کی جنگ لڑی گئی تھی۔"

پھر اسی غدّاری کا ذکر ولیم اڈورڈس (WILLIAM EDWARDES) اپنی کتاب "بنگال کے ایک سول افسر کی یادداشتیں" (REMINISCENCES OF A BENGALI CIVILIAN) میں یوں ذکر کرتا ہے:۔

"گلاب سنگھ نے اپنے لشکر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اُس وقت تک انگریزی لشکر پر حملہ نہ کرے کہ جس وقت تک راجہ خود ان کے ساتھ شامل نہ ہو لے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز حملہ کر کے سوبراؤں کے میدان کو ہاتھ میں لے لیں گے، راجہ لیت ولعل سے وقت ضائع کرتا رہا۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ سکھّوں کو شکست ہوئی تو انگریزوں نے لاہور پر قبضہ جما لیا تو ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ لاہور پر دستخط ہوئے جس میں ظاہر کیا گیا تھا۔ کہ راجہ گلاب سنگھ سے بعد میں جداگانہ معاہدہ بھی کیا جائیگا۔

اپنے سیاسی اغراض کے پیش نظر اُس وقت پنجاب پر کلیتہً تسلط جمانے

کے طرفدار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "خالصہ دربار" کی آزادی تسلیم کر لینے پر اپنی آمادگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن راجہ گلاب سنگھ نے اپنے مستقبل کو روشن بنانے کیلئے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انگریز کے لئے قبضہ کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ انگریزوں نے لاہور میں قدم رکھتے ہی تاوانِ جنگ طلب کیا۔ سکھ خزانہ میں اس وقت بقول مسٹر مارشمین (MARSH MAN) پچاس لاکھ روپے سے زائد رقم نہ تھی۔ اور لارڈ ہارڈنگ مُصر تھے کہ ڈیڑھ کروڑ پُورا کیا جائے۔ چنانچہ اس موقع پر راجہ گلاب سنگھ کی غداری کام آئی۔ اس نے اپنی خدمات اور خالصہ دربار سے اپنی غداری کو پیش کرتے ہوئے ۷۵ لاکھ روپے اس شرط پر ادا کرنے کا اقرار کیا کہ اُسے جموّں اور کشمیر کا راجہ تسلیم کر لیا جائے۔ انگریزوں کیلئے اس وقت کشمیر جیسے دُور دراز علاقہ پر قبضہ رکھنا یا اس کے نظم و نسق کو چلانا بہت مشکل تھا۔ اس وجہ سے وہ رضا مند ہو گئے اور راجہ گلاب سنگھ ۷۵ لاکھ روپیہ ادا کرتے ہوئے "حقوق حکمرانی" خرید لئے۔ اور اس سلسلہ میں مشہور "معاہدہ امرتسر" پر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو دستخط ہوئے (دیکھو ضمیمہ ۲ اور ۲ الف)

اس معاہدہ کی رُو سے جموّں اور کشمیر بشمول گلگت (جس پر ۱۸۴۲ء میں سکھوں نے قبضہ کیا تھا) اور لداخ وغیرہ راجہ گلاب سنگھ کے زیر تسلط آ گئے۔ اور راجہ نے اقرار کیا کہ وہ انگریزوں کے شاہی اقتدار کو تسلیم کرنے کے ثبوت میں سالانہ ایک گھوڑا۔ بارہ بھیڑیں خاص نسل کی (جن میں چھ نر اور چھ مادہ ہوں گی) اور چھ کشمیری شالیں اور تین کشمیری رومال پیش کرنے لگا۔

اِس معاہدۂ امرتسر کی رُو سے ضلع ہزارہ کا علاقہ بھی مہاراجہ کشمیر کے زیرِ تسلط آ گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اُسے مانسہرہ اور سوچیت گڑھ وغیرہ علاقہ سے تبدیل کر لیا گیا۔

معاہدۂ امرتسر کے بعد گلاب سنگھ کو کشمیر پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس نے ملک پر قبضہ کر لینا چاہا۔ لیکن سکھوں کے آخری گورنر شیخ امام الدین نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حق نمک ادا کرتے ہوئے خالصہ دربار کی حمایت میں جنگ جاری رکھی۔ گلاب سنگھ نے جو حالات بگڑتے دیکھا تو انگریزوں سے امداد کی درخواست کی۔ وہ ۷۵ لاکھ روپے وصول کر چکے تھے، امداد دینے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ہنری لارنس (HENRY LAWRANCE) کی قیادت میں سکھ اور انگریزی لشکر نے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ شیخ امام الدین نے حالات سے مجبور ہو کر اطاعت قبول کر لی اور جنگ کے جواز کے لئے خالصہ دربار کے لعل سنگھ کا ایک حکمنامہ پیش کر دیا۔ جس میں اطاعت قبول نہ کرنے کی ہدایت درج تھی۔ اس طرح گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ لعل سنگھ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا اور اس کی پاداش میں وہ ہندوستان کی طرف جلاوطن ہوا۔

جب انگریز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سندِ حکمرانی مل چکی۔ جس کے متعلق علامہ ڈاکٹر اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

دہقان و باغ و کشت و گلستاں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

لاکھوں انسانوں پر حکومت کرنے کے اختیارات ۷۵ لاکھ روپے کے عوض میں خریدے جا چکے۔ اور مال فروخت کرنے والوں نے باشندگانِ کشمیر کو بھیڑ بکریوں کی طرح ڈوگروں کے حوالے کر دیا تو پھر حکمران کو ڈر کس کا تھا؟ وہ اِنسانوں کے اس ہجوم کو جانوروں کے گلے اور مویشیوں کے ریوڑ سمجھ کر ہانکنے لگا۔ ہندو مسلمان دونوں پسنے لگے۔ بلاشبہ ہندوؤں کو وقتاً فوقتاً ہندو ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ رعایت مل جاتی رہی لیکن مسلمان کے لئے اس سرزمینِ جموّں و کشمیر پر کوئی جائے پناہ باقی نہ تھی۔ ڈوگرے جو خود کشمیری نہ تھے کشمیریوں پر حکومت کرنے لگے۔ حکمران کی مرضی اس کا قانون تھی۔ اس کے احکام اٹل سمجھے جاتے رہے اور راجہ گلاب سنگھ سے جس قسم احکام کی توقع کی توقع کی جا سکتی تھی، اُسے مشہور مورخ پنیکار یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"وہ ایک ایسے مدرسہ میں پڑھا کہ جہاں جھوٹ، فریب، سازش اور غداری سب ہی سیاسیات کے حصّے بخرے سمجھے جاتے تھے"۔

اور عام حالات کے سلسلہ میں لفٹننٹ کرنل ٹورنز (LT. COL. TORENS) کی رائے خاص وقعت سے پڑھی جا سکتی ہے جس میں وہ لکھتا ہے:۔

"سابقہ حکمرانوں نے بلاشبہ بھاری ٹیکس عاید کئے تھے لیکن اس نے (گلاب سنگھ نے) تو لوگوں کے خون کو چوس لیا۔ انہوں نے پیداوارِ زمین کے بہت بڑے حصّے پر قبضہ کیا تھا۔ کھڈیوں کے منافع پر ہاتھ ڈالا تھا لیکن اُس نے تو سب کچھ نچوڑ کر اپنے خزانہ میں داخل کر لیا"۔

میاں رنبیر سنگھ

راجہ گلاب سنگھ نے اپنی زندگی ہی میں میاں رنبیر سنگھ کو مختار کل بنا رکھا تھا اور گلاب سنگھ کا یہ بیٹا حقیقتاً ۱۸۵۶ء سے حکمران تھا۔ لیکن ۴ اگست ۱۸۵۷ء کے بعد کہ جس دن راجہ گلاب سنگھ اس دنیا سے رخصت ہوا۔ میاں رنبیر سنگھ تاج و تخت کا مالک نظر آنے لگا۔ یہ زمانہ انگریزوں کے لئے سخت ابتلاء و آزمائش کا زمانہ تھا۔ ملک بھر میں بدامنی تھی۔ ایسے وقت میں گلاب سنگھ کی موت اور رنبیر سنگھ کی قیادت انگریزوں کے لئے باعث پریشانی بن سکتی تھی لیکن باپ بیٹا دونوں انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے۔ انگریز کی خدمت و خوشامد ان کی زندگی کے مقاصد تھے۔ ملک میں گلاب سنگھ کے عہد کا سا جبر و استبداد جاری رہا۔ ظلم و ستم میں کوئی کمی نہ آئی۔ البتہ اپنے انگریز آقاؤں کو خوش رکھنے میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دی گئی۔ انگریزوں کی جانب سے بھی لفظی انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب زیب گلو ہوا۔ اور ۱۸۷۷ء میں دہلی کے اجتماع کے موقع پر "اندر مہندر بہادر۔ سپر سلطنت" کا موروثی اعزاز عطا کیا گیا۔ اور گھر بیٹھے راجہ رنبیر سنگھ "جرنیل" کے معزز اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

اسی راجہ کے عہد میں انگریزوں نے وسط ایشیا کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اور انگریزوں کے اغراض کے پیش نظر انگریز اور مہاراجہ دونوں نے اس علاقہ پر لشکر کشی بھی کی اور "ہنزہ" اور "نگر" جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی گئی۔ حتیٰ کہ چترال کی دور دراز ریاست نے بھی مجبور ہو کر ۱۸۷۶ء میں انگریز اور کشمیر کی مشترکہ سیادت قبول کر لی اور ہنزہ

اور نگر کی ریاستوں کیلئے بھی سیادت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔
بالآخر میاں رنبیر سنگھ ۱۲ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ہمیشہ کے اس دنیا سے چل دیئے۔

میاں پرتاپ سنگھ

رنبیر سنگھ کے تین بیٹوں میں پرتاپ سنگھ سب سے بڑا تھا۔ جس نے ۲۵ ستمبر ۱۸۸۵ء کو عنان سلطنت سنبھالی۔ دوسرے دو رام سنگھ اور امر سنگھ بالترتیب ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۹ء میں اس دنیا سے چل بسے۔ جبکہ پرتاپ سنگھ ۱۹۲۵ء تک حکمران رہا۔ پرتاپ سنگھ کے عہد میں انگریزوں نے کشمیر کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کی۔ اب انہیں احساس ہونے لگا کہ ۷۵ لاکھ روپیہ کے عوض اس کو بیچ دینے میں کسی تدبّر سے کام نہ لیا گیا تھا۔ ہندوستان کے دفاع کیلئے کشمیر سے آگے نکل کر قدم جمانے از بس ضروری تھے۔ چنانچہ اسی راجہ کے عہد میں ہنزہ اور نگر سے بڑھ کر گلگت اور اس کے آگے بھی انگریزوں نے اپنے تحفظ کا انتظام کیا۔ ۱۸۸۰ء میں انگریزی لشکر کشمیریوں کی امداد سے گلگت میں پھر داخل ہوا۔ ہنزہ اور نگر کے حکمرانوں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ انگریزوں کو گلگت آنے جانے کیلئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اسکے باوجود ان دونوں ریاستوں پر انگریزوں نے ۱۸۹۱ء میں قبضہ کر لیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر عمل میں آیا۔ پھر ۱۸۹۲ء میں ان ریاستوں کے حکمرانوں کو دوبارہ اختیارات تفویض کئے گئے۔ انگریز اور مہاراجہ دونوں کی سیادت قائم ہوئی۔ بالآخر یہ دونوں ریاستیں جو اندرونی طور پر آزاد تھیں سیاسی حیثیت میں تابع فرمان دربار کشمیر ہو گئیں اور ہنزہ نے ۱۶ تولہ ۵ ماشہ

اور نگر نے ۷ تولہ ایک ماشہ سونا سالانہ بطور نذرانہ یا بطور اقرار قبولِ سیادت دینا منظور کر لیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ پرتاپ سنگھ کے گدی نشین ہونے کے بعد انگریزوں نے کشمیر کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی چنانچہ گدی نشین ہونے کے ساتھ ہی راجہ کو ایک مجلسِ انتظامیہ ترتیب دینی پڑی جس میں راجہ نے صدر، اسکے بھائی امر سنگھ نے نائب صدر اور انگریزوں کے دو نمائندوں نے ارکان کے پارٹ ادا کئے۔ یہ مجلس ۱۹۰۵ء تک قائم رہی جس کے بعد عنانِ سلطنت راجہ نے پھر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اپنے بھائی امر سنگھ کو وزیر اعظم نامزد کیا۔ اور مزید تین وزرا، مقرر کئے۔ پھر ۱۹۲۲ء میں مہاراجہ نے ایک مجلس ترتیب دی۔ اس دفعہ کرسیٔ صدارت پر وہ خود متمکن ہوا۔ تو اپنے بھتیجے راجہ ہری سنگھ کو رکن اعلےٰ اور معاملات خارجہ مقرر کیا اور اس کے ساتھ تین مزید ارکان اسی مجلس میں شامل ہوئے۔

راجہ پرتاپ سنگھ پہ بھی انگریزوں کا لفظی ابرِ کرم برستا رہا۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں اسے گھر بیٹھے "کرنیل" ۱۸۹۶ء میں "میجر جنرل" اور ۱۹۱۶ء میں "لفٹنٹ جنرل" بنا دیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں جی، سی، ایس، آئی ۱۹۱۱ء میں جی، سی، آئی، ای اور ۱۹۱۸ء میں جی، بی، ای کے خطابات اس کے زیبِ گلو کئے گئے۔ کشمیر کا یہ پہلا راجہ تھا۔ جسے جنگِ یورپ کی خدمات کے صلہ میں اکیس توپوں کی سلامی لینے کا اعزاز یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو عطا ہوا۔

راجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں مظلوم کشمیریوں پہ جو مظالم ڈھائے جاتے

تھے اس کا دھندلا سا خاکہ آپ کو ان بگاریوں کی سرگذشت سے مل سکتا ہے جن کے متعلق کرنل اے ڈیورنڈ (COL. A. DURAND) اپنی کتاب "میکنگ آف اے فرانٹیر" (MAKING OF A FRONTIER) میں یوں لکھتا ہے:۔

" ان لوگوں (کشمیریوں) کو سرکاری کام پر لگانے کا کوئی معاوضہ نہ دیا جاتا تھا۔ اور انہیں اپنی خوراک وغیرہ کا انتظام بھی خود ہی کرنا ہوتا تھا "

پھر حکومتِ کشمیر کے افسروں اور ان کشمیریوں سے ان کے سلوک کے متعلق کرنل ڈیورنڈ کہتا ہے:۔

" تمام افسر اور سپاہی یا تو ڈوگرہ قوم سے ہیں یا دوسرے ہندوؤں سے کہ جنہیں کشمیریوں سے کسی قسم ہمدردی نہیں ۔ سپاہی مزدوروں سے کتوں کا سا سلوک کرتے اور انہیں اس طرح پیٹتے تھے، جیسے کوئی بوجھ اٹھانے والے جانوروں کو پیٹتا ہے "

اپنے اغراض کو پورا کرنے کی غرض سے راجہ پرتاپ سنگھ نے انگریز کی خوشامد اور آؤ بھگت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کی ۔ وہ جانتا تھا کہ باشندگانِ کشمیر پر ظلم و ستم کی بارش انہی خوشامد کے بادلوں کی آڑ میں برسائی جا سکتی تھی ۔ چنانچہ انگریز کو خوش کرنے کے لئے اسی راجہ کے عہد میں کشمیری لشکر پہلی بار ریاست کے باہر خدمات سر انجام دینے کو بھیجا گیا ۔ اس لشکر میں زیادہ تر بلا زمین علاقہ پونچھ کی پہاڑیوں کے باشندے تھے ۔ انہوں نے راجہ کی خوشنودی کے لئے انگریز کے اغراض پر اپنی

جانیں فدا کردیں۔ اور ۱۹۱۴ء میں کشمیر سے چل کر مشرقی افریقہ میں لڑے۔ فلسطین میں ترکوں کے سینے چھلنی کئے۔ عربوں پر آگ برسائی۔ پھر ۱۹۱۹ء کی تیسری جنگِ افغانستان میں افغانوں کے خلاف نبرد آزما رہے اور ریاست ہائے ہنزہ اور چترال بھی اسی راجہ کے ہاتھوں، جسے انگریز تقویت دے رہا تھا محفوظ نہ رہیں۔

ہندوستانی قومی تحریکات کا اثر

ہندوستان میں جنگِ یورپ کے دوران میں اور اس کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی۔ باشندگانِ کشمیر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے چنانچہ تحریکاتِ مخالفت رولٹ ایکٹ اور خلافت کی چنگاریوں نے سرد سرزمینِ کشمیر کو گرما دیا۔ راجہ کے ظلم و ستم سے مفلوج قلب حرکت کرنے لگے اور گنگ زبانوں میں قوتِ گویائی پیدا ہونے لگی۔ گو غلامی کے طوق و سلاسل بھاری اور بوجھل تھے۔ تاہم وہ کشمیریوں کو تلملانے سے روک نہ سکے اور رفتہ رفتہ ان زبانوں کی دھیمی دھیمی آوازیں اور ان لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آہٹ راجہ پرتاپ سنگھ کو بے قرار کرنے کا باعث بنی۔ یہ وقت ہندو باشندگانِ کشمیر کے لئے بہت ہی ابتلاء و آزمائش کا وقت تھا۔ وہ جانتے تھے کہ "ڈوگرہ شاہی" میں ہندو مسلم دونوں کچلے جا رہے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اگر وہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے تو "ہندو راج" کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ جسے وہ کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ہندو حکمران کے خلاف آواز بلند کرنا اُن کے نزدیک بدترین قسم کا پاپ تھا۔ اور راجہ کی مخالفت یا مُسلم مطالبات کی حمایت نہ کرنے کے معنے یہی تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو اقلیت بھی

مصائب و آلام کا شکار رہے۔ انہوں نے اس موخر صورت کو ہی پسند کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہندو ہر حالت میں ہندو راجہ کے ابر کرم کا امیدوار ہو سکتا تھا۔ اور مسلمان کے مقابل کشمیری ہندوؤں پر ڈوگرے نسبتاً کم ہی ظلم کر سکتے تھے۔

مسلمانوں نے اپنی پسماندگی کا احساس کرتے ہوئے جب پہلی بار احتجاج کیا تو ۱۹۱۶ء میں حکومت ہند کے مشیر تعلیم مسٹر شارپ نے کشمیر کا دورہ کرتے ہوئے اپنی سفارشات لکھ بھیجیں جنہیں راجہ نے منظور کر لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمران کی رسمی منظوری کے باوجود وہ سفارشات کبھی شرمندۂ معنی نہ ہو سکیں۔ حالات یونہی چلتے رہے کہ بالآخر لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے ۱۹۲۴ء میں کشمیر کا سفر اختیار کیا مسلمانوں نے پہلی بار ایک سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے اپنی حالت زار کا رونا رویا۔ راجہ پرتاپ سنگھ کو مسلمانوں کی یہ حرکت بہت ہی ناگوار گذری لیکن منہ دھونے کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ جو انگریز، ہندو اور مسلم تین ارکان پر مشتمل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رونے والوں کو اور رولایا گیا۔ زخمی دلوں پر نمک پاشی کی گئی۔ یعنی اس محضر نامہ پر کئی ایک دستخط کرنے والوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اور بعض کو جلاوطنی کے احکام ملے۔

اس طرح اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کے دوران میں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو راجہ پرتاپ سنگھ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چل بسا۔

ڈوگرہ راج کا آخری دور

جبر و تشدد کی انتہا

ہری سنگھ

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اسلئے اس کی وفات پر عنانِ سلطنت اسکے بھتیجے ہری سنگھ پسر امر سنگھ کے ہاتھ لگی جس نے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد اپنے اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سرزمینِ کشمیر پر جبر و استبداد کے دور کو جاری رکھا۔ انگریز کی خوشامد اور چاپلوسی اس خاندان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اور اسی خاندانی عادت کی وجہ سے اس نے اپنے انگریز آقاؤں کو خوش رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ یورپ کے سفر اور عیش و عشرت میں وقت بسر کرتے ہوئے باشندگانِ کشمیر کی دولت کو مفت میں لٹایا جاتا رہا۔ انگریز بھی حسبِ عادت

لفظی ابرِ کرم برساتا رہا۔ تختِ کشمیر پر بیٹھنے سے قبل اور اس کے بعد خطابات کی بارش مسلسل ہوتی رہی۔ فوج میں یکے بعد دیگرے اعزازی عہدے ملتے حتے کہ ۱۹۳۵ء میں اسے "میجر جنرل" بنا دیا گیا۔ تو کشمیر کا یہ حکمران بالآخر "میجر جنرل ہز ہائی نس مہاراجہ سر ہری سنگھ اندر مہندر بہادر سپر سلطنت جی، سی، ایس، آئی کے، سی، وی، او، اے، ڈی، سی وغیرہ پکارا جانے لگا۔ اور اس کی سلامی میں اکیس توپیں داغی جانے لگیں۔

مہاراجہ کا پہلا اعلان

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں طوق و سلاسل کے بوجھ تلے دبے ہوئے مسلمان آہ و بکا سے ایوانِ سلطنت کو اپنی طرف متوجہ کر چکے تھے اور بیرونِ کشمیر میں بھی اُن کی دردناک صدائیں قلبِ مُسلم کو تڑپا رہی تھیں۔ اُن کی یہ حالتِ زار دیکھ کر مسلمان خاموش نہ رہ سکے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب سے راجہ کے حضور میں ایک محضر نامہ پیش کرنے کی درخواست گذاری گئی۔ لیکن نشۂ اقتدار نے مہاراجہ کو محضرنامہ قبول کرنے سے روکا۔ اور اس نے بدیں وجہ انکار کر دیا۔ کہ محضرنامہ بیرونِ کشمیر کے افراد کا مُرتّب کردہ تھا۔ یہ انکار نہ تو مسلمانوں کو مطمئن کر سکتا تھا۔ نہ خاموش۔ اس نے توتِ عمل میں اور اضافہ کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی بے بسی کا اور زیادہ یقین ہُوا اُن کے سینوں میں یہ آگ اور زیادہ بھڑکنا شروع ہوئی۔ مہاراجہ نے عوام کے تیور بدلتے دیکھے تو ۱۹۲۷ء میں اعلان کر دیا۔ کہ آئندہ ریاست کی تمام آسامیوں پر صرف باشندگانِ ریاست کو ہی مقرر کیا جائے گا۔ لیکن عملاً تمام اعلےٰ عہدوں پر راجپوت مقرر ہونے لگے اور فوج تو کلیتہً ہندو ڈوگروں کے لئے مخصوص

کر دی گئی۔ اس طرح راجہ کا یہ پُرفریب اعلان مسلمانوں کی اشک شوئی نہ کر سکا

مہاراجہ کے اخراجات

قطع نظران عیاشیوں کے کہ جن کی ہر ایک سے کشمیر اور بیرون کشمیر کا بچہ بچہ واقف ہے ۱۹۲۵ء میں تین لاکھ پونڈ کے مشہور مقدمہ فریب دہی کا یہ راجہ شکار اور مرکزی کردار بنا۔ اور عدالت میں سر جان سائمن نے اُسے کمینہ، ناتجربہ کار۔ انتہائی بزدل ذلیل اور بے حیا کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔

ریاست کی آمدنی کا بیشتر حصہ راجہ اور اس کے خاندان کے افراد ہڑپ کر جاتے ہیں۔ راجہ کل آمدن کا ۵ فیصدی تو اپنے اخراجات کے لئے وصول کرتا ہے۔ چنانچہ جس سال کے اعداد و شمار مل سکے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس سال راجہ نے اس ۵ فیصدی کے حساب سے ساڑھے تیرہ لاکھ روپے وصول کئے۔ علاوہ ازیں راجہ کو ساڑھے آٹھ لاکھ روپے بطور جاگیر ملے۔ مزید برآں مہارانی رانی اور ولیعہد کے اخراجات کے لئے ساڑھے چار لاکھ اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کیلئے کہ جو حقیقتاً مہاراجہ اور اس کے خاندان کے لئے وقف ہے تیرہ لاکھ روپے دیئے گئے۔ اس طرح گویا راجہ اور اس کا خاندان خزانہ ریاست سے کوئی چالیس لاکھ روپے سالانہ اڑا لے جاتے ہیں اور یاد رہے کہ راجہ کو یہ حق بھی حاصل ہے۔ کہ وہ "خاص ضرورت" کے وقت اس سے زائد رقم اور وہ بھی اپنی حسب خواہش وصول کرلے۔

انہی حالات میں سرالبین بینرجی ۵ سال تک وزارت خارجہ پر متمکن رہنے کے بعد جب ۱۹۲۹ء میں مستعفی ہوا۔ تو اس نے اپنے ایک بیان میں کہا۔

"ریاست جموں اور کشمیر بہت سی دشواریوں میں گھری پڑی ہے
اس کی بہت بڑی مسلم آبادی علم سے بے بہرہ، دیہاتوں میں مقیم
مفلسی اور اقتصادی پستی کا شکار اور حکومت کے ہاتھوں بے
جان مویشیوں کی طرح ہانکی جا رہی ہے۔"

چودھری غلام عباس کی قیادت

مشترکہ ہندوستان میں جاری شدہ تحریکات مثلاً "رولٹ ایکٹ" اور خلافت کی صدائیں کشمیر کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت پیدا کر چکی تھیں ملک میں بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ عوام میں احساس کی کوئی کمی نہ تھی اور ضرورت تھی۔ تو یہ کہ کوئی بارِ قیادت اپنے کندھوں پہ اٹھا لے۔ چنانچہ ان حالات میں تحریکِ خلافت کے ایک کارکن چودھری غلام عباس میدانِ عمل میں نکل کھڑے ہوئے انہوں نے جموں میں باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں جنگِ آزادی کی بنیاد رکھنے والے یہی چودھری غلام عباس تھے۔ جموں میں "ینگ مین ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک انجمن قائم ہو گئی۔ اس کے بعد علاقہ کشمیر میں بھی ایک دارالمطالعہ "فتح کدل ریڈنگ روم" کے نام سے قائم ہوا۔ ان اداروں میں تعلیم یافتہ نوجوان مجتمع ہو کر اپنے مستقبل پہ غور و فکر کرنے لگے اپنی پسماندگی اور کس مپرسی کی حالت پر غور کی جانے لگی۔ تھوڑے عرصہ بعد حکومت کی جانب سے "سول سروس ریکروٹنگ بورڈ" کا قیام عمل میں آیا تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنا مطالبہ پیش کرنے کا موقع ملا۔ تو انہوں نے مطالبہ کیا۔ کہ مسلمانوں کو ملازمتوں میں نمایاں حصہ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں

ستمبر ۱۹۳۱ء کو فتح کدل ریڈنگ روم کے ارکان پر مشتمل ایک وفد نے اس بورڈ سے ملاقات کی۔ شیخ محمد عبداللہ جو انہی ایام میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا۔ اور ریڈنگ روم کے ہر روز کے آنے والوں میں تھا۔ اس وفد میں شامل کر لیا گیا۔

وزارت میں مسلمان نظرانداز کر دیئے گئے

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان میں بے چینی اور بدامنی کا زمانہ تھا۔ کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ اس دوران میں حکومت برطانیہ نے لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی دعوت شمولیت ملی۔ تو اس نے روانگی سے قبل نظام سلطنت کو سنبھالنے کے لئے ایک کمیٹی مرتب کی جو مسٹر جی۔ای۔سی ویکفیلڈ (انگریز) مسٹر پی کے وٹل (سندو) جرنیل جنک سنگھ (ڈوگرہ) اور ٹھاکر کرتار سنگھ (ڈوگرہ) پر مشتمل تھی۔ کمیٹی کے اوّل الذکر دو ارکان ریاست کے باشندے نہ تھے۔ اور موخر الذکر دو ایک ہی قوم ڈوگرہ سے نامزد کئے گئے تھے۔ اس طرح ۸۰ فیصدی مسلم آبادی کو کلیتہً نظرانداز کر دیا گیا۔ جس نے مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ مسلمان اسے برداشت نہ کر سکے۔ اظہار ناراضگی کیا جانے لگا۔ صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ اس پر حکومت کے بعض افسروں کی حماقتوں نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ حکومت کی مخالفت میں ہمہ گیر تحریک شروع ہو گئی۔ اور ہر شخص اس کمیٹی کے تقرر کو اپنی ذاتی بے عزتی سمجھنے لگا۔

توہین اسلام! ملک اس وقت تک پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

عام جلسوں میں تقریریں سُنی جانے لگیں۔ جلوس نکلنا شروع ہوئے۔ اور عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم نظر آنے لگا کہ مساجد اور خانقاہوں میں جہاں سیاسیات پر لب کشائی کی اجازت تک نہ تھی۔ وہاں سیاسی بحثیں اور تقریریں شروع ہوئیں اسی دورِ بیداری کے ماہ اپریل ۱۹۳۱ء میں عید کے دن کسی پولیس افسر نے امام مسجد کو خطبۂ عید پڑھنے سے روک دیا۔ اس کے چند دن بعد جموں کی پولیس لائن میں ہندو سپاہیوں نے قرآن شریف کی بے حُرمتی کی۔ اور ڈیگوار کے مقام پر نماز ادا کرنے کے لئے میدان کے استعمال کی اجازت نہ ملی۔ یہ واقعات ایسے نہ تھے۔ جنہیں ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیا جاتا۔ ملک کے طول و عرض میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی جلوس اور جلسے شروع ہوئے۔ اور ان تمام واقعات کو پوسٹر کی شکل میں لکھ کر تقسیم کیا جانے لگا۔ محمدؐ اسمٰعیل نامی پہلا رضا کار تھا۔ جو ان پوسٹروں کو تقسیم کرنے کے جرم میں بمقام جموں گرفتار ہوا۔ کشمیری نوجوان قانون شکنی پر اُتر آئے۔ تو سری نگر میں اس تحریک کا آغاز کر دیا گیا۔ ارکانِ حکومت نے گھبرا کر ہتھیار پھینک دیئے۔ اور مسلمانوں کے وفد کو مطالبات پیش کرنے کے لئے از خود طلب کیا۔ چنانچہ ماہ جون ۱۹۳۱ء میں جموں اور کشمیر کے قومی کارکنوں کا ایک وفد مرتب ہوا۔ جو ذیل کے ارکان پر مشتمل تھا۔ جموں سے چوہدری غلام عباس۔ مستری یعقوب علی۔ گوہر رحمان اور شیخ عبدالمجید اور کشمیر سے سیف الدین مثال۔ میر واعظ یوسف شاہ میر واعظ ہمدانی۔ سید حسین شاہ۔ خواجہ غلام احمدؐ آشائی۔ شیخ

محمد عبداللہ اور منشی شہاب الدین۔

یوم آزادی ادھر یہ وفد ملاقات کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ادھر صوبہ سرحد کے ایک باشندے عبدالقدیر نے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے مسلمان کشمیر کو حکومت کے مظالم کی توجہ دلائی۔ انہیں اپنی بے حسی پر ملامت کی بزدلی اور کمزوری پر شرمسار کیا۔ اور ایسی پر جوش تقریر کی کہ ہر مسلم باشندۂ کشمیر تلملا اٹھا۔ ان کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ حکومت نے عبدالقدیر کو گرفتار کرتے ہوئے قید و بند میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عوام بے قابو ہو گئے۔ ریاست کے طول و عرض میں آگ بھڑکنا شروع ہوئی۔ جموں اور کشمیر میں جلوس اور جلسے نظر آنے لگے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو "یوم آزادی" منایا گیا۔ ریاستی بندوقوں سے مسلمانان کشمیر کے سینے چھلنی ہونے لگے کئی کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ کئی مسلمان شہید ہوئے اور جوش کا یہ عالم تھا۔ کہ لوگ شہداء کو اٹھائے خون آلود پرچم ہاتھوں میں لئے شہر کا گشت کرنے لگے۔ ان حالات میں چودھری عباس، گوہر رحمان اور مستری یعقوب علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد غلام نبی، عبدالرحیم اور شیخ عبداللہ بھی گرفتار ہو کر ۱۵ جولائی کو قلعہ ہری پربت میں قید کر دیئے گئے۔ تحریک زیادہ زور سے چلنے لگی۔ جس پر حکومت نے اپنی خیر اسی میں دیکھی۔ کہ ان لوگوں کو رہا کرے۔ چنانچہ عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اسی ماہ جولائی کے آخر میں ان زعماء کو رہا کر دیا گیا۔

یوم کشمیر مشترکہ ہندوستان میں تحریک آزادی کشمیر پوری طرح حمایت پیدا کر چکی تھی۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی قیادت اور

مرزا بشیر الدین محمود کی صدارت میں ایک وقار کمیٹی مصروفِ عمل تھی۔ اس کمیٹی نے تحقیقاتِ حال کے لئے ایک وفد کشمیر بھیجنا چاہا۔ لیکن ریاست سے اجازت نہ مل سکی۔ چنانچہ احتجاج کے طور ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو ہندوستان اور کشمیر میں "یوم کشمیر" منایا گیا۔ اور پورے زور سے منایا گیا۔ یہی وقت تھا جبکہ کانگرس کو نزاکتِ حال کا احساس ہوا۔ اور اس نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سیفو کو کشمیر بھیجا۔ جہاں اوّل الذکر نے "عدم تشدد" کا درس پڑھایا۔ تو مؤخر الذکر نے کشمیریوں کو "وسعتِ قلب" دکھلانے کی نصیحت کی۔ لیکن ان کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ تحریک بدستور چلتی رہی۔ اور مسلمانانِ کشمیر کے آگے بڑھتے ہوئے قدم واپس نہ لوٹائے جا سکے۔ مہاراجہ نے جو یہ حال دیکھا۔ تو کسی با اثر شخص کی تلاش شروع ہوئی۔

نظرِ انتخاب نواب سر مہر شاہ پر پڑی کہ اُن کے مرید بڑی تعداد میں علاقہ جموں اور کشمیر میں آباد تھے۔ نواب موصوف نے کوشش کی تو ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء کو حکومت اور ارکانِ ملی میں "عارضی صلح" کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان نے عوام میں مایوسی پیدا کر دی۔ مہاراجہ کی شاطرانہ چال کامیاب رہی۔ تحریک نرم پڑی۔ تو حکام نے روایتی چالبازیوں سے کام لیا۔ اور کئی ایک قومی کارکن دوبارہ گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن حکومت کا اندازہ غلط نکلا۔ تحریک میں پہلے سے زیادہ تیزی اور شدت پیدا ہوئی۔ اور اس تیزی سے چلی کہ حکومت نے اسے دبانے کے لئے بار بار گولی چلا کر مسلمانوں کے خون سے سرزمینِ کشمیر کو لالہ زار بنا دیا۔ عورتیں اور بچے تک شہید کئے گئے۔ اور بالآخر ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مارشل کی قسم کا ایک آرڈیننس جاری کر دیا۔

آرڈی نینس جاری ہو جانے کے بعد دُوسرے دن فوج کو شہر میں لایا گیا اور باشندگانِ شہر کو حکم ملا کہ وہ کھڑے ہو کر "ریاستی جھنڈے" کی سلامی اتاریں۔ عورتیں اور بچے بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ساتھ ہی مارشل لاء کا نفاذ ہُوا۔ بسرسری عدالتوں میں مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ سزائیں دی جانے لگیں دکانداروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نیچے پھینکا گیا۔ مال و اسباب لُوٹ لیا جاتا رہا۔ ڈوگرہ سپاہیوں نے گھروں میں داخل ہو کر مستورات کی بے حُرمتی کی حکومت یا اس کی فوج۔ پولیس یا کسی افسر کے خلاف لب کشائی بغاوت کے مترادف تھی۔ اور ایسی حرکات پر سربازار بید مارے جاتے تھے۔ اکثر اشخاص کو میراکدل کے قریب بالکل برہنہ کرتے ہوئے بیک وقت تیس تیس بید مارے گئے۔ اس جبرو استبداد کا چرچا ملک کے طول وعرض میں سُنا جانے لگا۔ تحریک نے زور پکڑا۔ تو ہر طرف عوامی مظاہروں کا ایک طوفان امڈ آیا۔

مُسلم مُطالبات جب اس ظلم و ستم سے بھی مُسلمانانِ کشمیر کے جذبات کو کچلا نہ جا سکا تو پھر راجہ نے ایک اور شاطرانہ چال چلی۔ ۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو آرڈی نینس واپس لے لیا گیا۔

سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکام صادر ہُوئے۔ اور ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا۔ کہ باشندگانِ ریاست مہاراجہ کے حضور میں اگر کوئی درخواست یا مطالبات پیش کرنا چاہیں تو ان پر دربارِ کشمیر ہمدردانہ غور کرے گا۔ چنانچہ اس اعلان کے بعد ہندو، سکھ اور مُسلمانوں نے جُدا جُدا اپنے مطالبات پیش کئے۔ ہندوؤں کو تو پہلے ہی سب کچھ حاصل تھا۔ وہ

مزید مطالبہ کرتے تو کیا کرتے۔ رسماً چند امور پیش کر دیئے گئے۔ البتہ سکھوں نے سیاسیات سے اپنی روایتی لاعلمی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا۔ کہ وزارت میں ایک سکھ کو جگہ دی جائے ملازمتوں میں انہیں ۳۲ فیصدی حقوق ملیں اور فوج کی اعلیٰ و ادنیٰ سب ملازمتوں میں انہیں تیسرا حصّہ دیا جائے۔

مسلمانوں کے مطالبات ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ "آئینی طرز حکومت"۔

۲۔ ریاست کے ہر باشندے کو مجلس آئین ساز کے انتخاب میں رائے دینے اور امیدوار کھڑا ہونے کا حق۔

۳۔ مجلس آئین ساز کے ۷۵ فیصدی ارکان کا انتخاب

۴۔ وزراء براہِ راست مہاراجہ کے سامنے جوابدہ ہوں لیکن مجلس آئین ساز کے ۷۰ فیصدی ارکان اگر اُن پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیں تو ان لیے مستعفی ہونا لازمی قرار دیا جائے۔

۵۔ مذہبی آزادی کے ساتھ تحریر و تقریر کی آزادی اور عام باشندوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

۶۔ مسلمانوں کو ملازمتوں میں ۷۰ فیصدی نشستیں دی جائیں۔

۷۔ علاقہ کشمیر کے باشندوں کو علاقہ جموں کے راجپوتوں کی طرح اسلحہ رکھنے کی اجازت ہو۔

اور

۸۔ مسٹر شارپ کی سفارشات کی روشنی میں تعلیمی اصلاحات کا اجراء کیا جائے

حکومت ہند کی مداخلت

۱۹ ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مہاراجہ نے مسٹر مڈلٹن کی صدارت میں ایک جوڈیشل تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردی۔ جو سرکاری اور غیر سرکاری افراد پر مشتمل تھی لیکن مسلمانوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ ملک میں تحریک زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ اور جموں کے علاقہ میں ہمہ گیر شکل اختیار کر گئی۔ پنجاب سے مجلس احرار کے زیر اہتمام رضا کاروں کے جتھے دھڑا دھڑ پہنچ رہے تھے۔ گو ۵ ر اکتوبر کے متذکرہ اعلان نے ان کی رفتار میں عارضی سی کمی پیدا کردی تھی۔ تاہم وہ جلد ہی پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ آنے لگے۔ حتیٰ کہ ۳۱ اکتوبر کو جموں میں ہمہ گیر سول نافرمانی شروع ہو گئی پنجاب کے وہ اخبارات جن کا داخلہ حدود کشمیر میں بند کر دیا گیا تھا۔ علانیہ بازاروں میں بیچے جانے لگے۔ اب حکومت بھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر مقابلہ اتر آئی۔

۲ ر نومبر کو فوج نے شہر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تو کئی فرزندان اسلام نے جام شہادت نوش کیا۔ جب حالات پہ قابو نہ پایا جا سکا۔ اور مہاراجہ کو اپنی بے بسی نظر آنے لگی۔ تو اس نے حکومت ہند سے امداد طلب کی۔ وہاں کیا دیر تھی۔ وائسرائے ہند امداد کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے آرڈی ننس جاری کرتے ہوئے بیرون ریاست سے آنے والے رضا کاروں کا ریاست میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ اور ساتھ ہی ۴ ر نومبر ۱۹۳۱ء کو انگریزی فوج نے ریاست میں داخل ہو کر حالات کو قابو میں کر لینے کی کوششیں شروع کر دیں۔

گلنسی کمیشن

اُدھر مہاراجہ حکومت ہند سے فوجی امداد طلب کر رہا تھا۔ ادھر مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیئے ان تمام اوقاف کے

واپس کر دینے کے وعدہ کا اعلان کیا جانے لگا۔ کہ جو ریاست کے قبضہ میں تھے اور پھر ایک اور شاطرانہ چال یوں چلی گئی۔ کہ حکومت ہند کے اشارہ سے ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو مسٹر گلنسی کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ تاکہ وہ نفاذ اصلاحات کے سلسلہ میں حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرتے ہوئے اس رہنمائی کرے چنانچہ اوائل ۱۹۳۲ء میں گلنسی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ جس میں مجلس آئین ساز کے فوری قیام کی سفارش بھی شامل تھی۔

مسلم کانفرنس اس وقت تک کشمیر کی مشہور نمائندہ جماعت "مسلم کانفرنس" کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ۱۵۔ ۱۶ اور ۱۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو اس کے پہلے تاریخی اجلاس ہوئے۔ مسلمان اگرچہ گلنسی کمیشن کی سفارشات سے مطمئن نہ تھے۔ تاہم انہوں نے ان کے فوری نفاذ کا مطالبہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کارکنان مسلم کانفرنس کی عملی سرگرمی نے مسلم کانفرنس کو حقیقی معنوں میں نمائندہ جماعت بنا دیا۔ کوئی ڈیڑھ سال اس کشمکش میں صرف کرنے کے بعد ارکان مسلم کانفرنس نے جب دیکھا۔ کہ مہاراجہ یونہی وقت ضایع کر رہا ہے۔ تو انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو اور بھی تیز کر دیا۔ مہاراجہ نے پھر حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے ۲۸ جنوری ۱۹۳۴ء کو ایک آرڈی ننینس کا نفاذ کر دیا گیا قومی کارکن گرفتار ہوئے۔ اور سات مشہور زعمائے ملت کو کہ جن میں چودھری غلام عباس بھی تھے۔ ملک بدر کر دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک نے پھر زور پکڑا۔ حکومت کی فوج اور پولیس بھی مصروف عمل نظر آنے لگی۔ سلسلۂ قید و بند شروع ہوا۔ حتیٰ کہ ۲ فروری کو فوج نے گولی چلائی۔ اور ملک میں پھر نئے سرے جبر و استبداد کا سا دور دورہ نظر آنے لگا۔ ان حالات میں مسلم کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس

ریاست سے باہر سیالکوٹ میں طلب کیا گیا۔ جہاں چوہدری غلام عباس کو مختیار کل مقرر کرتے ہوئے اختیارات دے دیئے گئے۔ کہ وہ مسلمانانِ کشمیر کے حقوق تسلیم کرانے کے لئے ہر ممکن اقدام کریں وہ اِن فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھے۔ کہ گرفتار ہو کر ایک سال کے لئے قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔

مجلس آئین ساز چودھری غلام عباس کی گرفتاری کے بعد مجلس آئین ساز کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جس کی ۷۵ نشستوں میں سے صرف ۳۲ مسلمانوں کو ملیں یا یوں کہیئے کہ ۸۵ مسلم آبادی کو ۵۰ فیصدی نمائندگی بھی نہ دی گئی مسلمان مطمئن نہ ہوئے۔ تاہم مسلم کانفرنس نے اپنے اُمیدوار کھڑے کئے، اور سو فی صدی کامیابی حاصل کی مسلم کانفرنس کے اہنی اُمیدواروں میں ایک شیخ محمد عبداللہ بھی تھے اب پبلک سٹیج کی بجائے ایوان مجلس آئین ساز میں گرما گرم بحثیں شروع ہوئیں۔ حکومت پر لے دے کی جانے لگی۔ بلا شبہ حکومت کے ساتھ نامزد ارکان کی اکثریت تھی لیکن منتخب شدہ ارکان کی پُشت پناہی لاکھوں عوام کر رہے تھے حکومت اور منتخب ارکان میں ٹکر ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے ایک ہندو رکن کے باقی تمام ارکان مجلس آئین ساز ۱۹۳۶ء میں ایوان سے واک آوٹ کر گئے۔

نیشنل کانفرنس ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام "یوم حکومت خود اختیاری" منایا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں ہلچل نظر آنے لگی۔ گو اس میں ہندوؤں نے بھی شمولیت کی لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت سے ہندوؤں کو مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق کھٹکنے لگا۔ وہ تاڑ گئے۔ کہ تحریک کی کامیابی حقیقتاً مسلم اکثریت کی کامیابی ہے۔ آل انڈیا کانگرس بھی کہ جو اس وقت

تک عملاً ہندو مفاد کی نگہبان ثابت ہو چکی تھی۔ خاموش نہ رہ سکی۔ اس کی نظر میں بھی مسلمان کی کامیابی ایک ہندو حکمران کی تباہی کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ اس نے کشمیر کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ سازشوں کے جال بچھائے جانے لگے۔ سیم و زر کی بارش شروع ہوئی۔ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے "مزدور کسان سبھا" کے نام سے انجمنیں عالم وجود میں آگئیں "کشمیر یوتھ لیگ" نے جنم لیا۔ کانگریس کمیٹی بھی نظر آنے لگی حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء میں مشہور کانگریسی ڈاکٹر اشرف نے کشمیر یوتھ لیگ کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کانگریس کا پرچار کیا۔ شیخ عبداللہ کو گانٹھا جانے لگا۔ مسلم کانفرنس پر کانگریس کا رنگ چڑھانے کی کوششیں شروع ہوئیں تاآنکہ ۱۹۳۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کے بیس ارکان میں سے چھ کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے "نیشنل کانفرنس" کی بنیاد ڈال دی اور جلد ہی اس کا الحاق ریاستی کانگریس سے کر دیا گیا۔ کہ جس کے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو تھے۔ اور اس طرح ثابت کر دیا۔ کہ نیشنل کانفرنس کا قیام مہاراجہ کے اشارہ اور کانگریس کے ایماء سے صرف اس لئے عمل میں آیا۔ کہ مسلمانوں کی یکجہتی اور مطمح نظر ایک نہ رہے۔

نیشنل کانفرنس بن جانے کے بعد مسلمان دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ انڈین کانگریس کے اثر و رسوخ اور روپے اور مہاراجہ کی درپردہ پشت پناہی سے مسلم کانفرنس کو ختم کر دینے کی تجویزیں ہونے لگیں۔ بار بار یہ سوال زیر بحث آیا۔ کہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں مدغم کر دیا جائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ اس تحریک سے مسلم کانفرنس کو سخت دھکا لگا۔ اور کارکنوں کے بٹ جانے

سے ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچا لیکن یہ ایں ہمہ مسلمان مسلم کانفرنس کی حمایت میں نیشنل کانفرنس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ ۲۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو جب میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر جشن منانے کا سوال در پیش ہوا۔ تو نیشنل کانفرنس کبھی عملی اقدام کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اور اُسے فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دیتے ہوئے الگ تھلگ نظر آنے لگی شیخ محمد عبداللہ نے ذاتی حیثیت سے جشن میلاد میں شمولیت کی تو اس پر بھی ہندو رفقاء نے اُنہیں ستانا شروع کیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کو نیشنل کانفرنس سے اور زیادہ متنفر کر دیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسی سال پھر کشمیر کا سفر اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود جب نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس طلب کیا گیا۔ تو اس میں بہت کم مسلمان شریک ہوئے۔ اور علاقہ جموں سے تو کسی ایک مسلمان نے بھی شمولیت نہ کی۔

قائداعظم کا سفر کشمیر

اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے کشمیر کی تحریکات دھیمی پڑ گئیں۔ دوم جنگ یورپ کا زمانہ حقیقتؐ تحریک کشمیر کے جمود کا زمانہ تھا۔ ۱۹۴۴ء میں قائداعظم محمد علی جناحؒ نے کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ تو وہاں کے مسلمانوں میں پھر سے زندگی پیدا ہوئی۔ شیخ عبداللہ اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لئے قائداعظم پر اثر ڈالنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب قائداعظم نے اپنے "دو قوم" کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر اصرار کیا۔ تو شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو سخت ٹھیس لگی۔ کانگرس ان حالات سے بے خبر نہ رہ سکتی تھی۔ وہ حالات کا

جائزہ لیتی اور اپنے ایجنٹوں کے کام سے اپنی کامیابی کا اندازہ لگاتی رہی۔ تا آنکہ ۱۹۴۵ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کشمیر پہنچ کر ایک دفعہ پھر مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی آخری کوشش کر ڈالی۔

کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ

پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بچشم خود کشمیر کی حالت دیکھلی تو شیخ عبداللہ پر ابر کرم زیادہ تیزی کے ساتھ برسنے لگا مسلمانوں میں پھوٹ پیدا کرنے کا یہی بہترین ذریعہ بن سکتا تھا۔ ادھر شیخ عبداللہ کے لئے مسلم کانفرنس وبال جان بن چکی تھی۔ شوق حصول اقتدار نے اُسے اندھا کر رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ ایک طرف مہاراجہ بالواسطہ اس کی خدمات سے خوش تھا۔ تو دوسری طرف کانگرس بلاواسطہ اپنے اطمینان کا اظہار کر رہی تھی۔

افضل بیگ نامی ایک شخص نیشنل کانفرنس کی حمایت سے "وزیر عمومی" بن چکا تھا۔ اس طرح شیخ عبداللہ کو ایوان حکومت کے اندر حمایت حاصل تھی۔ اور ایوان کے باہر انڈین کانگرس جیسی مضبوط جماعت اس کی پشت پناہ تھی۔ اس طاقت کے گھمنڈ میں براہ راست مہاراجہ سے گفتگو کرنے کے لئے شیخ عبداللہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو نشہ حکومت نے اجازت نہ دی۔ اُس نے درخواست کو ٹھکرا دیا۔ مہاراجہ کی حماقتوں میں ایک اور حماقت کا اضافہ ہوا۔ شیخ عبداللہ بہت سٹ پٹایا۔ اس کی پوزیشن مضحکہ خیز بن گئی۔ ان حالات میں افضل بیگ نے کہ جو نیشنل کانفرنس کے رحم و کرم پر تھا وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ شیخ عبداللہ کو اپنے اقتدار کی فکر ہوئی

تو اُس نے "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔

یہ نعرہ لگا کر شیخ عبداللہ نے مہاراجہ سے مطالبہ کیا۔ کہ وہ کشمیر کے تاج و تخت سے دست بردار ہو کر عنانِ سلطنت عوام کے سپرد کر دے۔ اور معاہدہٗ امرتسر کو ناجائز قرار دیتے ہوئے مہاراجہ کی قیادت و سیادت کو خلاف آئین و اخلاق قرار دیا۔ عوام کے لئے یہ نعرہ بہت ہی دلکش و جاذبِ توجہ ثابت ہوا۔ لیکن مہاراجہ ہری سنگھ بھلا کب اس نعرہ سے خائف ہو کر تاج و تخت چھوڑنے والا تھا۔ وہ مقابلہ کے لئے اُتر آیا۔ جبر و استبداد کی پالیسی میں اور زیادہ سختی کر دی گئی۔ حسب سابق ڈوگرہ سپاہیوں نے اپنے وحشی پن کا ثبوت دیا۔ عوام مصائب و آلام کا شکار ہونے لگے۔ گولیوں کی بوچھاڑیں سُنی جانے لگیں۔ اور عام باشندوں کو ایک ٹانگ پر چلنے۔ زمین پر رینگنے اور مہاراجہ کی جے کے نعرے لگانے پر مجبور کرنا ان سپاہیوں کا معمول بن چکا تھا۔

ان حالات میں پنڈت نہرو ۱۹۴۶ء میں پھر وارد کشمیر ہوئے۔ تا کہ شیخ عبداللہ کو اپنی امداد و اعانت کا یقین دلا سکیں۔ مہاراجہ نشۂ اقتدار میں بالکل اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے پنڈت جواہر لعل نہرو کا کشمیر میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ کوہالہ کے پُل پر حکام نے پنڈت جی کو روک لیا۔ لیکن وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے دو میل تک ملک کے اندر جا پہنچے اگر مہاراجہ اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے پنڈت نہرو کے داخلہ کشمیر پر پابندی نہ لگاتا تو یقین غالب تھا کہ پنڈت جی مہاراجہ اور شیخ عبداللہ میں سمجھوتہ کرا دیتے۔ لیکن راجہ کی حماقت نے پنڈت جواہر لعل کو وقتی طور گرما دیا۔

دیا۔ وہ سرینگر جانے پر مُصر تھے کہ انڈین کانگرس کے ایماء سے دربار کشمیر نے انہیں واپس ہندوستان بھیجدیا۔ اور پنڈت جی واپس لوٹے تو جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف کسی قسم کا اقدام حقیقتاً ہندو اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہونا تھا۔ اس وجہ سے کوئی حرکت نہ کر سکے۔ ادھر حکومت نے شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد چودھری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے دوسرے ارکان کو بھی قید و بند میں ڈال دیا گیا۔

اکثریت کو اقلیت بنا دینے کا ارادہ

مہاراجہ ہری سنگھ کو ریاست میں ایک دائمی خطرہ نظر آنے لگا وہ ان تحریکات کو برداشت نہ کر سکا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ مسلم اکثریت مطالبہ حقوق کو چھوڑنے والی نہیں تو اس کا علاج اس میں دیکھا کہ مسلم اکثریت کو اقلیت بنا دیا جائے اور اس ناپاک ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگ کے ارکان کو علاقہ جموں میں آباد ہو جانے کی دعوت دی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۷ء ہی میں پونچھ کے علاقہ میں ڈوگرہ فوج نے اپنی سرگرمیاں دکھانا شروع کر دیں۔ عوام کو ہراسان و پریشان کیا جانے لگا تاکہ وہ وطن چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔

تقسیمِ ہند

یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ حکومت برطانیہ نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان سے مہاراجہ اور بھی پریشان ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ جغرافیائی محلِ وقوع، آبادی اور کلچر کے لحاظ سے کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا پڑیگا۔ اس وجہ

سے اس نے اپنی سرگرمیوں کو اور تیز کر دیا۔
گو ریما ً عارضی طور پاکستان سے " ساکن معاہدہ " بھی کر لیا۔ لیکن مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے ارادے پر بدستور عمل ہوتا رہا۔
حتیٰ کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ نے مشرقی پنجاب کے سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگ کے ارکان کو کشمیر میں آباد ہونے کی اعلانیہ دعوت دیکر ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا۔ یہ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ ادھر ریاست کے طول و عرض میں ڈوگرہ فوج کی چوکیوں کا جال بچھا دیا گیا۔ ریاست کے باشندوں سے تمام اسلحہ جو اُن کے پاس تھا حکماً چھین لیا گیا۔ اور انہیں نہتہ کر دینے کے بعد ڈوگرہ فوج کی درازدستیاں شروع ہوئیں اور ابتداء علاقہ پونچھ سے کی گئی۔ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ ان کے مکان نذرِ آتش کیے جانے لگے۔ مسلم عورتوں کی عصمت تک ان کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی۔ گاؤں کے گاؤں جلائے جانے لگے۔ اور یہ وبا ایسی ہمہ گیر تھی کہ کوہ مری (پاکستان) کے علاقہ سے بھی جلتے ہوئے دیہات کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ تمام راستے بند تھے۔ تاہم جب خبریں باہر نکلیں تو حکومت پاکستان نے کئی بار احتجاج کرتے ہوئے مہاراجہ کو اس طرف متوجہ کیا۔ لیکن مہاراجہ اپنے ناپاک ارادہ سے ہٹ نہ سکا۔

جوشِ انتقام

اس قتل و غارت گری کو دیکھتے ہوئے مسلمان تلملانے لگے۔ اسّی ہزار سے زائد جنگجو مسلمان صرف پونچھ کے علاقہ میں آباد تھے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں، کہ جو جنگِ یورپ

کے محاذوں پر داد مردانگی دے چکے تھے۔ لیکن بیچارے بے بس تھے۔ جو تھوڑا بہت اسلحہ ان کے پاس تھا۔ وہ حکومت حکماً اور جبراً چھین چکی تھی۔ اس وجہ سے کچھ کر نہ سکے۔ تاہم ان کے کئی شیر دل اس سعی میں مصروف نظر آنے لگے کہ موقع ملے، تو مہاراجہ سے بدلہ چکا ہیں۔

انہی ایام میں سردار محمد ابراہیم جو سرینگر میں حکومت کے زیر نگرانی زندگی گذار رہے تھے۔ ڈوگرہ فوج اور حکام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر سرینگر سے راولپنڈی پہنچ گئے۔ کئی دوسرے رفقاء بھی آملے تو راولپنڈی میں بیٹھ کر ہی انہوں نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور تیاری شروع کردی۔

آزاد کشمیر حکومت کا قیام

سردار محمد ابراہیم کے راولپنڈی پہنچ جانے کے بعد مزید سرگرمی شروع ہوئی۔ اب اسلحہ کی تلاش کی جانے لگی۔ سپاہیوں کی کمی نہ تھی لیکن اسلحہ نایاب تھا۔ راولپنڈی، کوہ مری اور پونچھ کے علاقے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور ان کی آبادی بھی کچھ اس طرح رشتے ناطوں میں جکڑی ہوئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں بیرون پونچھ کے باشندے تماشائی کی حیثیت سے اس قتل و غارتگری کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اسلحہ جمع کیا جانے لگا۔ اور جلد ہی کافی مقدار میں اسلحہ و بارود ہزاروں مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے علاقہ پونچھ تک پہنچا دیا گیا۔ اور اندر ہی اندر تیاری کی جانے لگی۔ تاکہ مہاراجہ سے اس کے کئے کا بدلہ لیا جائے۔

جب تھوڑی بہت مقدار میں اسلحہ فراہم ہوگیا تو مجاہدین پونچھ نے حملہ کی تیاری شروع کردی۔ ان سابقہ فوجی سپاہیوں نے آپس میں علاقے بانٹ لئے۔ ہر علاقہ کا جدا جدا کمانڈر مقرر ہوا اور اسی نیم تیاری کی حالت میں عبدالقیوم نامی مجاہد نے اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لئے شروع اکتوبر

۱۹۴۷ء میں کوہالہ کے قریب تحصیل باغ کے گاؤں سالیاں میں فوجی چوکی پر حملہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح جنگِ آزادی شروع ہوئی۔ اور پھر ۱۶ راکتوبر کو نیلا بٹ کے قریب دھیر کوٹ میں جو علاقہ باغ میں واقع ہے حملہ کرتے ہوئے بہت سے اس اسلحہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا جو ڈوگرہ سپاہی عوام سے چھین کر وہاں جمع کر چکے تھے۔

ہندوستان سے الحاق

ان حالات کو دیکھتے ہوئے راجہ نے مقابلہ میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ اس نے خود اپنی نگرانی میں ڈوگرہ قوم میں اسلحہ تقسیم کرایا۔ مسلمانوں پر مصائب و آلام کے بادل انتہائی شدت سے برسنے لگے۔ قتل و غارت گری میں میں کوئی کسر باقی رہنے نہ دی گئی۔ باشندگانِ کشمیر ہزاروں کی تعداد میں بھاگ کر پاکستان میں داخل ہونے لگے۔ جہاں حکومت نے ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ مہاراجہ نے جو حکومتِ ہند سے پہلے ہی ساز باز کر چکا تھا۔ ۲۶ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومتِ ہند سے الحاق منظور کرنے کی درخواست کر دی۔ ساتھ ہی فوجی امداد طلب کی۔ وہاں کیا دیر تھی، بنا بنایا کھیل تھا۔ درخواست منظور ہو گئی اور ۲۷ راکتوبر کو ہندوستانی لشکر کا پہلا دستہ بذریعہ ہوائی جہاز سری نگر پہنچ گیا۔ اس کے بعد مزید لشکر مسلسل واردِ کشمیر ہوتا رہا۔

شیخ محمد عبداللہ کو قید سے رہائی ملی۔ اسے وزیرِ اعظم کے ساتھ بطور مشیر لگا دیا گیا۔ وہ بھی اپنے آپ کو وزیرِ اعظم تصور کرنے لگا۔ اس

طرح شیخ عبداللہ جو مہاراجہ سے "کشمیر چھوڑ دو" کا مطالبہ کر رہا تھا حصولِ اقتدار کے نشہ میں ملت کشی پر آمادہ کر لیا گیا۔ اور اس کی غداری کی وجہ سے ہزاروں مسلمان قتل ہوئے لاکھوں گھروں سے بے گھر ہو کر مہاجر بنے ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں کے گھر بار لٹے اور ہزاروں کی عصمت برباد کر دی گئی۔

جس ۲۶ر اکتوبر کو مہاراجہ کشمیر حکومت ہند سے الحاق کی درخواست کے ساتھ فوجی امداد طلب کر رہا تھا۔ اسی ۲۶ر اکتوبر کو قائداعظمؒ نے مہاراجہ کو تار دیا جس میں مرقوم تھا کہ مہاراجہ کی نیت درست معلوم نہ ہوتی تھی اور وہ بیرونی امداد اور ہندوستان سے الحاق کرنے کے لئے بہلنے تلاش کر رہا تھا۔ چنانچہ ۲۷ر تاریخ کو جب مہاراجہ کا تار شائع ہوا تو قائداعظم کے بیان کی تصدیق ہو گئی جس پر حکومت پاکستان نے اعلان کر دیا کہ یہ الحاق دھوکہ اور فریب پہ مبنی تھا اس وجہ سے حکومت پاکستان اسے تسلیم نہ کر سکی۔

حکومتِ ہند اور مہاراجہ کشمیر کی اس حرکت کو دیکھتے ہوئے پاکستان چاہتا تو وہ بھی اپنا لشکر کشمیر میں داخل کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ بلکہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے قائداعظمؒ نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یہ تجویز پیش کر دی کہ دونوں حکومتوں کے گورنر جنرل اور وزراء اعظم مل کر اس مسئلہ کو حل کر لیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو قائداعظم کے سامنے آنے سے ہچکچاتا تھا بیمار پڑ گیا۔ اور یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔

اس پر بھی قائداعظمؒ نے صلح و صلاحیت سے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو مزید تجاویز بھیجدیں۔ جو مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہیں کہ :۔

(۱) دونوں حکومتوں کے گورنر جنرلوں کو اختیارات دے دئے کہ وہ ملکہ کشمیر کی جنگ بند کرادیں اور ضرورت پڑے تو اس مقصد کے لئے طاقت بھی استعمال کریں۔

(۲) ہندوستانی لشکر اور پاکستانی باشندے جو اس وقت کشمیر میں برسرپیکار ہیں۔ وہاں سے واپس لوٹا دئے جائیں۔

(۳) دونوں گورنر جنرلوں کو اختیارات دئے جائیں کہ وہ ریاست میں امن و امان قائم کرنے کے بعد استصواب رائے عامہ کا انتظام کریں۔ تاکہ الحاق کے متعلق کشمیریوں کی آزادانہ رائے معلوم ہوسکے۔

حکومتِ ہند نے یہ تجاویز بھی مسترد کردیں۔ ہندوستانی فوج کو کشمیر میں مقیم رکھنے پر اصرار کیا۔ شیخ محمدؐ عبداللہ کی حکومت کو عوام کی مرضی سے مرتب شدہ بتایا اور استصواب رائے عامہ کو اس عبداللہ حکومت کے زیرِ نگرانی کرانے پر زور دیا۔ اس طرح یہ تجاویز شرمندۂ عمل نہ ہوسکیں۔

قبائلی مجاہدین

مہاراجہ سر ہری سنگھ کی ڈوگرہ فوج اسکے ساتھ سکھ اور ارکانِ راشٹریہ سیوک سنگ نے جب پونچھ کے مسلمانوں پر مصائب و آلام کے بادل برسانے شروع کئے جب ان باشندوں سے اسلحہ چھین کر انہیں نہتہ کر دیا گیا جب ان کا مال و

دولت، ان کی عزت وحرمت اور زندگی تک گرداب خطرات میں گھر گئی۔ تو مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ میدان میں کود پڑے انہوں نے ذلت کی زندگی پہ عزت کی موت کو ترجیح دی۔ جوں توں کر کے تھوڑا بہت اسلحہ حاصل کیا۔ اور اس کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء کو علاقہ باغ میں راجہ کی طاقت کے خلاف پہلی گولی چلا دی گئی۔ پونچھ کے جانباز جو عرصہ دراز تک انگریزی لشکر میں ملازمتیں کر چکے تھے ریاستی لشکر کے مقابل نظر آئے اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں انہوں نے دو تین اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

ابتدا میں تو بہت ہی کم اطلاعیں ملک سے باہر نکل سکیں لیکن جلد ہی یہ اطلاعیں ملک کے طول وعرض میں سنی جانے لگیں۔ اضلاع راولپنڈی اور ہزارہ کے باشندے اپنے تعلقات اور استطاعت کے مطابق امداد کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان مظالم نے باشندگان صوبہ سرحد اور ماورائے سرحد کو گرما دیا۔ ان کا خون کھولنا شروع ہوا۔ قلب مسلم بے قرار نظر آنے لگا۔ وہ ان مظالم کو ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ امداد واعانت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اواخر اکتوبر ۱۹۴۷ء تک کافی مقدار میں انفرادی اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں وارد کشمیر ہونے لگے۔ ان قبائلیوں کی آمد سے مقامی مجاہدین کے حوصلے بلند ہوئے۔ رفتہ رفتہ سرحد اور ماورائے سرحد میں اس تحریک نے زور پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے وزیر، محسود آفریدی، مہمند اور دیگر قبائل کے جتھے شوق جہاد میں کشمیر کی طرف کوچ کرتے دکھائی دیئے۔

حکومت پاکستان سخت مشکلات میں گھر گئی۔ کشمیر کی کثرت آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اور وہ پاکستان سے الحاق کے طرفدار تھے۔ ویسے جغرافیائی حیثیت سے بھی کشمیر کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیئے تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کر لینے کے بعد پاکستان کی سیاسی حیثیت کلیتہً مفقود ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک طرف ہندوستان کا خلاف آئین ریاست کشمیر پر قبضہ کر لینا اور دوسری طرف وہاں مسلمانوں کے قتلِ عام کو حکومت پاکستان ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ساتھ ہی آئینی حیثیت میں پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار نہ تھے۔ اور گو ہندوستان آئین و اصولِ اخلاق سے آنکھیں بند کر چکا تھا۔ پاکستان نے اس کی غلط تقلید نہ کی۔ ایسی حالت میں قبائیلوں کو کشمیر کی طرف جانے کی اجازت دینے یا نہ دینے کا بہت ہی اہم اور خطرناک سوال پیدا ہو گیا۔ کچھ قبائلی پہاڑیوں میں دُور دراز کا سفر طے کرتے ہوئے کشمیر پہنچ رہے تھے اور بہت سے براہِ راست پاکستان سے گذرنے لگے۔ عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت اس بڑھتے ہوئے جوش کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اور قبائلی مجاہدین کے راستہ میں کسی قسم کی رکاوٹ خود مملکتِ پاکستان میں بدامنی پیدا کرنے کے مترادف سمجھی جانے لگی۔ مہاراجہ سر ہری سنگھ اپنی حماقت سے ایسی فضا پیدا کر چکا تھا کہ پاکستان کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ کہ وہ ان کے راستہ میں حائل نہ ہو اور باشندگانِ پاکستان

کو اجازت دے دے کہ وہ مجاہدینِ کشمیر کی امداد و اعانت کریں۔

مہاراجہ سرہری سنگھ نے جب ہندوستان سے الحاق کر لینے کا اعلان کیا تو ہندوستانی لشکر سرزمینِ کشمیر پہ اتار دیا گیا۔ ان کے پاس جدید قسم اسلحہ، ہوائی جہاز، ٹینک اور کیا کچھ نہ تھا۔ اس طاقت و قوت کے نشہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل نے اعلان کر دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کا چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں میں فیصلہ کر دیں گے۔ اس اعلان نے مسلمانوں کو اور گرمایا۔ قبائلی زیادہ سے زیادہ تعداد میں مصروفِ جہاد نظر آنے لگے۔ انہوں نے ڈوگرہ فوج کا تو ابتدائی حملوں میں صفایا کر دیا پھر ہندوستانی لشکر کو پسپا کرنے لگے اور قریب تھا کہ وہ سرینگر پر قبضہ کر لیں کہ بعض بندگانِ اغراض کو حصولِ اقتدار کی ہوس نے اندھا کر دیا۔ وہ ملت کی بجائے اپنے مفاد کی فکر کرنے لگے۔ اس کش مکش میں اس پیش قدمی کو دھکا لگا اور شدید دھکا لگا۔ اس لغزش یا خود غرضی نے بنا بنایا کھیل برباد کر دیا۔ لشکر میں بددلی پیدا ہونے لگی۔ دنوں کا کام مہینوں پہ جا پڑا۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جنگ جاری رہی اور جلد ہی لشکر میں پھر پہلا سا جوش اور اعتماد پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں حکومتِ ہند بوکھلا اٹھی۔ ان کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ وہ حکومتِ پاکستان کے خلاف الزام تراشنے لگی۔ بین الاقوامی قوانین اور روایات کے خلاف پاکستانی علاقہ پہ کئی بار بمباری کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود حکومتِ پاکستان مشتعل نہ ہوئی اور اس نے اپنے تدبر سے حکومتِ ہند کو جابر و ظالم ثابت

کرتے ہوئے بار بار مطالبہ کیا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ اس کے باشندوں کی آزادرائے پر چھوڑ دیا جائے۔

اسی دوران میں ریاست چترال نے سیادت کشمیر کا جو برائے نام جوا پہن رکھا تھا۔ اتار پھینکا۔ ریاستہائے ہنزہ اور نگر نے کشمیر سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ ادھر دیر اور سوات نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ ان تمام ریاستوں کے لشکر میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے لگے۔ ان میں کی ہر ریاست کے باشندے نے دوسری ریاست سے سبقت لے جانے کی سعی کی۔ ان ریاستوں کے باشندے جدید قسم اسلحہ کے استعمال اور رائج الوقت فنونِ جنگ سے آشنا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود میدانِ جہاد میں اس ہمت، جرأت اور دلیری سے انہوں نے مقابلہ کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ دشمن سٹ پٹا اٹھا۔ اور ان جنگوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ جو دنیا میں سترھویں صدی یا اس سے قبل لڑی جا چکی تھیں۔

آزاد حکومت کا قیام

گذشتہ اوراق میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ کہ مسلمانانِ کشمیر اوائل اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ہی ڈوگرہ شاہی کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے۔ بعد میں قبائلی مجاہدین کی امداد و اعانت بھی انہیں میسر آ گئی جس سے جنگ زیادہ تیزی سے لڑی جانے لگی۔ سردار محمد ابراہیم ڈوگرہ حکومت کی آنکھوں میں دھول ڈال کر راولپنڈی پہنچ چکے تھے۔ یہیں مسلم کانفرنس کے دوسرے ارکان کے اتحاد و اتفاق سے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو "عارضی آزاد حکومت جموں و کشمیر" کی بنیاد

رکھ دی گئی۔
عارضی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ایک طرف میدانِ جہاد میں مصروفِ جہاد لشکر کی دیکھ بھال اور ان کی قیادت کے فرائض ادا کئے جانے لگے تو ساتھ ہی مقبوضہ علاقہ میں نظم و نسق کی فکر دامنگیر رہی۔ جو لوگ اپنی قسمت آزاد حکومت سے وابستہ کر چکے تھے یا جن علاقوں پر آزاد حکومت کا قبضہ ہو چکا تھا وہاں کے سول اور فوجی نظام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جانے لگا۔ عدالتیں قائم ہوئیں۔ سول اور فوجی افسروں کا تقرر عمل میں آیا۔ تجار اور دوسرے باشندوں کو سہولتیں بہم پہنچائی جانے لگیں۔ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے کے لئے اخبار جاری ہوئے۔ اور ایک اچھا خاصہ ریڈیو سٹیشن پروگرام نشر کرتے سُنا جانے لگا۔

مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں

جب آزاد حکومت پوری مستعدی سے مصروفِ جنگ نظر آئی، جب مجاہدینِ کشمیر نے اس جنگ کو زندگی اور موت کا سوال بنا لیا، جب قبائلی مجاہدین نے کشمیر سے آخری ہندوستانی سپاہی کو نکال کر ہی دم لینے کا فیصلہ کیا، اور جب پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل کو اپنی خوابوں کی تعبیر الٹی نظر آنے لگی تو انہوں نے پاکستان کے خلاف الزام تراشتے ہوئے سلامتی کونسل میں پناہ لینا چاہی۔ اس طرح حکومتِ ہند نے ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسئلہ سلامتی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔ الزام براہِ راست حکومت پاکستان کے خلاف تھا۔

اس وجہ سے پاکستان کے لئے اپنی پوزیشن کا واضح کرنا ناگزیر ہو گیا ۔ چنانچہ چودہری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ حکومتِ پاکستان کی قیادت میں پاکستانی وفد لیک سیکسس (امریکہ) پہنچا ۔ جہاں ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو چودہری ظفر اللہ خان نے اپنی پر معنی اور مبسوط تقریر سے حکومت ہند کے الزامات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا ۔

سردار محمد ابراہیم صدر آزاد حکومت کشمیر ۲ ، نومبر ۱۹۴۷ء کو ہی بذریعہ تار سلامتی کونسل کی توجہ ڈوگرہ مظالم کی طرف منعطف کرا چکے تھے ۔ انہوں نے حکومتِ ہند کی یہ نئی چال دیکھی تو ۱۶ جنوری کو خود عازم امریکہ ہو گئے ۔ تاکہ ارکان سلامتی کو اصل واقعات سے رُوشناس کرا سکیں ۔ سلامتی کونسل کے اجلاس میں تو اُنہیں واقعات بیان کرنے کا موقع نہ ملا ۔ تاہم ارکانِ سلامتی کونسل اور دُنیا کے سامنے انہوں نے حقیقتِ حال بیان کرتے ہوئے مہاراجہ سر ہری سنگھ کی عیاری اور حکومتِ ہند کی چالبازیوں کو بے نقاب کر دیا حکومتِ ہند کے وفد میں شیخ عبداللہ بھی شامل تھا ۔ اسے سلامتی کونسل کے اجلاس میں تقریر کرنے کا موقع ملا تو اُس نے حکومتِ ہند کی پوزیشن کو اور زیادہ خراب کر دیا ۔ چنانچہ اُس کے طرزِ کلام کے متعلق کانگریسی حلقوں میں کہا گیا کہ وہ سلامتی کونسل کے اہم جلسہ میں یوں تقریر کر رہا تھا ۔ جیسے امیر الکدل (کشمیر) کے کسی عام جلسہ میں جھنجھلا کر تقریر کر رہا ہو ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ہند نے اُسے واپس بُلا لیا ۔ اور دوبارہ سلامتی کونسل کی طرف رُخ کرنے کی اجازت نہ دی ۔

کشمیر میں پاکستانی فوج کا داخلہ

ادھر سلامتی کونسل میں مجلس مناظرہ گرم تھی۔ نشستند۔ گفتند اور برخاستند کا منظر دنیا کو اپنی طرف متوجہ کئے جارہا تھا۔ اودھر کشمیر میں حکومت ہند نے عام جنگ کا سماں پیدا کر دیا۔ ہندوستانی لشکر نے جارحانہ اقدامات شروع کئے۔ اور اپریل ۱۹۴۸ء میں اس لشکر نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میدان کارزار گرم کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کشمیری بھاگ بھاگ کر پاکستان پہنچنے لگے۔ ہندوستانی لشکر نے اس عرصہ میں پوری ریاست پر قبضہ کر لینے کی ٹھان لی۔ پاکستان کو اپنی سرحدات کی فکر دامن گیر ہوئی۔ پاکستان کشمیر سرحد غیر محفوظ نظر آنے لگی۔ ہندوستانی لشکر کے اقدام کا خطرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان حالات میں حکومت پاکستان نے دفاع کئے: چند مخصوص مقامات پر علاقہ کشمیر میں (مئی ۱۹۴۸ء) اپنا محدود تعداد لشکر داخل کر دیا۔

ادھر تمام قصہ سن لینے کے بعد ارکان سلامتی کونسل نے حسب معمول فیصلہ کیا کہ ایک کمیشن موقع پر جا کر تحقیقات کرے۔ چنانچہ شروع جولائی میں یہ کمیشن آیا۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان میں کئی مہینے گذار دیئے۔ اس کے ارکان نے کشمیر کے ان دونوں حصوں کا دورہ کیا۔ جو آزاد حکومت اور حکومت ہند کے زیر تسلط تھے۔ اور اپنے تاثرات کو ایک رپورٹ کی شکل میں سلامتی کونسل کے سامنے پیش کرتے ہوئے ۱۳ اگست کو ایک قرارداد میں عارضی صلح کی تجویز پیش کر دی۔

چودھری غلام عباس کی رہائی

ادھر یہ کھیل کھیلا جارہا تھا۔ ادھر حکومت ہند نے ایک نئی شاطرانہ چال

چلی۔ "تقسیم حکومت" کے حربہ کو استعمال کرنے کی فکر میں تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ کہ کس طرح آزاد حکومت کے ارکان میں جنگ و جدل شروع کرائی جائے اور ان میں باہمی نفرت و حقارت کے جذبات کو مشتعل کرتے ہوئے انہیں ہوا دی جائے۔ ان ناپاک ارادوں کے پیش نظر چودھری غلام عباس کو جو دو سال سے بلا کسی مقدمہ چلئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے رہا کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ ان ایام جنگ میں تحریک حریت کشمیر کے اولین قائد کی رہائی کسی طرح متوقع نہ تھی۔ خود چودھری غلام عباس کو جب پہلے پہل یہ اطلاع ملی تو اعتبار نہ کر سکے۔ انہیں اچنبھا ہوا۔ لیکن وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حقیقتاً ڈوگرہ سپاہیوں نے انہیں سوچیت گڑھ پہنچانے کے بعد ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو آزاد کر دیا۔

اس رہائی کے بعد حکومت ہند حالات کا عمیق نگاہوں سے مطالعہ کرتی رہی۔ اُسے اپنے فقدان تدبر اور سیاسیات سے ناواقفیت کی بناء پر یقین تھا کہ اس اعلان رہائی کے بعد چودھری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم حصول اقتدار کے لئے آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی جس سے تحریک آزادی کا برباد ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر از حد مایوس ہونا پڑا۔ کہ رہائی کی اطلاع سننے کے بعد سردار ابراہیم نے ہی سب سے پہلے پیغام مبارکباد بھیجتے ہوئے چودھری غلام عباس سے صدارت قبول کر لینے کی درخواست کی۔ جس کے جواب میں چودھری غلام عباس نے سردار محمد ابراہیم کو ان کی صدارت پر مبارکباد دی۔ اس طرح ملت اسلامیہ کے یہ دونوں

فرزندِ جہادِ ملی ہیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے نظر آئے تو مہاراجہ سر ہری سنگھ اور حکومتِ ہند کو اپنے کئے پر اظہارِ ندامت کے ساتھ خون کے آنسو بہانے پڑے۔

اِلتوائے جنگ

عین اس وقت کہ آزاد کشمیر کا لشکر ہندوستانی افواج کو پسپا کرتے ہوئے تسخیرِ سرینگر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا کہ اِلتوائے جنگ کا اِعلان ہوا۔ اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۸ء اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب کو ایک منٹ کم بارہ بجے جنگ بند کردی گئی۔ حکومتِ ہند نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد پاکستان نے حسبِ وعدہ قبائلی لشکر کو واپس لوٹ جانے پر آمادہ کیا۔ اور پاکستانی لشکر بھی میدانِ جنگ سے ہٹا لیا گیا۔ برخلاف ازیں ہندوستان نے اپنے اقرار کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے افواج کو واپس نہ بُلایا بلکہ اُلٹا کشمیر میں مزید لشکر جمع کیا۔

اس کے بعد " التوائے جنگ " کے وقت کی حد بندی کا سوال پیش ہوا۔ تو ہندوستان، پاکستان اور سلامتی کونسل کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس کا اجلاس ۱۸ر جولائی ۱۹۴۹ء کو بمقام کراچی شروع ہوا۔ اور بالآخر ۲۰ر جولائی کو باتفاق آراء حدبندی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کانفرنس میں سلامتی کونسل کے ارکان کے علاوہ ذیل کے نمائندوں نے شمولیت کی۔

پاکستان :- میجر جنرل ڈبلیو ایس کاتھرن میجر جنرل نذیر احمد۔
مسٹر محمد ایوب اور مسٹر آفتاب احمد۔

ہندوستان :۔ لفٹنٹ جنرل ایس۔ ایم سری نگیش۔ میجر جنرل کے۔ ایس تھمیا۔ بریگیڈیر ایس۔ ایم مانکشا۔ مسٹر ایچ۔ ایم پٹیل اور میجر سنہا۔

اور مختصراً ذیل کی حد بندی کا اعلان کر دیا گیا۔

جنوب مشرق میں ہناور سے کیران اور وہاں سے مشرق میں مارول اور برف کی چٹانوں تک۔ شمالی پہاڑی علاقہ میں دریائے کشن گنگا سے توبت کے جنوب تک۔ یہاں سے یہ حد دریا کے شمال کی طرف گوریس اور وادی تلیل تک پہنچتی ہے اس کے بعد یہ لائن نالہ برزیل کو چوڑوان میں کاٹ کر نکل جاتی ہے۔ اس جگہ فریقین نے تسلیم کر لیا کہ اس نالہ اور منی مرگ (جو درہ برزیل سے قریباً پانچ میل ہے) کے جنوبی علاقہ میں چوڑوان تک تسلط تو پاکستان کا رہیگا لیکن اس علاقہ میں فوج نہ رکھی جائے گی۔

افسر استصواب رائے عامہ معاہدہ کے آخری اور اہم ترین حصّہ کے سلسلہ میں ہندوستان نے لیت و لعل کی پالیسی پر عمل شروع کیا حیلے بہانے تراشے جانے لگے۔ اور ہر طریقہ سے مسئلہ استصواب رائے عامہ کو التواء میں ڈالنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ سلامتی کونسل کو دوبارہ اس مسئلہ پر غور کرنا پڑا اور اس نے امیر البحر نمٹز (ADMIRAL NIMITZ) کو افسر استصواب رائے عامہ مقرر کر دیا۔ لیکن حکومت ہند کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آسکی اور اس افسر کو کام کرنے کا موقع ہی میسّر نہ آسکا۔ اور معاملہ جوں کا توں کھٹائی میں پڑا رہا۔

فیصلہ کیلئے حکم کا تقرر

سلامتی کونسل کے سامنے نئی نئی تجاویز پیش ہونے لگیں۔ دُنیا کے اس عظیم ترین ادارہ نے باشندگان کشمیر سے سوتیلی ماں کا سا سلوک جاری رکھا۔ دسمبر ۱۹۴۹ء جنرل میکناٹن (GEN. MC NAUGHTON) نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش۔ لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اس نے ۷ فروری ۱۹۵۰ء کو اپنی رپورٹ سلامتی کونسل کے سامنے پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ اس سلسلہ میں اس کی تگ و دو نہ کوئی نتیجہ پیدا کر سکی ہے۔ نہ پیدا کر سکتی ہے۔

اس ناکامی کے بعد سلامتی کونسل نے ۱۲ اپریل ۱۹۵۰ء کو مزید اقدام کرتے ہوئے آسٹریلیا کے ایک مشہور ماہر قوانین جج کو حکم بنا کر بھیجدیا۔ یہ سر ڈکسن (SIR. DIXON) نامی جج ۲۷ مئی ۱۹۵۰ء کو کراچی پہنچکر ہندوستان اور پاکستان کے چکر کاٹنا شروع ہوا۔ اس نے دونوں حکومتوں کے ذمہ دار افراد سے ملاقاتیں کیں۔ اور بالآخر دونوں حکومتوں کے وزراء اعظم ایک کانفرنس میں بیٹھے دکھائی دیئے۔ جو ۲۰ سے ۲۴ جولائی تک جاری رہی لیکن ہندوستان اپنی روش بدل نہ سکا کیونکہ اسے یقین ہے۔ کہ استصواب رائے عامہ کی صورت میں کشمیر پر اس کا چنگل قائم نہیں رہ سکتا۔ اور یوں وہ کشمیر کے بہت بڑے حصہ پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ سلامتی کونسل سے اسے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ سلامتی کونسل حقیقتاً امریکن برطانوی پالیسی کی گھر یلو لونڈی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اور یہ پالیسی اسوقت ہندوستان

سے کسی قسم بگاڑ پسند نہیں کرتی۔ رہی پاکستان کی مخالفت تو وہ برطانوی کامن ویلتھ کی رکنیت کی وجہ سے کوئی شدت اختیار نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ سرڈکسن کے مشن کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو اس سے قبل سلامتی کونسل کے دوسرے مشنوں کا ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرڈکسن بے نیل مرام واپس لوٹ گئے۔

سرڈکسن کے واپس چلے جانے کے بعد یہ مسئلہ ایک دفعہ پھر سلامتی کونسل میں زیر بحث آیا۔ ابھی تک زیر بحث ہے۔ اور اس وقت کسی بہتر نتیجہ کی توقع اس سے وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ سلامتی کونسل حقیقتاً امریکہ اور برطانیہ کے اغراض کی نگہبان ہے۔ وہ کسی ایسے مسئلہ میں عملی دلچسپی نہیں رکھتی جس کا تعلق امریکی برطانوی اغراض سے نہ ہو۔ ورنہ جو ادارہ کوریا پر لشکر کشی کر سکتا تھا۔ اور چالیس لاکھ باشندگان کشمیر کی آہ و بکا سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ کوریا میں امریکی مقاصد کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ اور کشمیر میں ابھی ایسا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔

ضمیمہ نمبر۱

شجرۂ نسب مہاراجہ سر ہری سنگھ

- میاں کشور سنگھ
  - راجہ گلاب سنگھ (جموں)
    - راجہ رنبیر سنگھ
      - مہاراجہ پرتاپ سنگھ
      - رام سنگھ
      - امر سنگھ
        - مہاراجہ سر ہری سنگھ
    - سوہن سنگھ
    - ادھم سنگھ
  - دھیان سنگھ (پونچھ)
    - موتی سنگھ
      - بلدیو سنگھ
        - چتر دیو سنگھ
        - پدم دیو سنگھ
        - جگت دیو سنگھ (جاگیردار پونچھ)
        - سکھ دیو سنگھ
    - جواہر سنگھ
    - ہیرا سنگھ
  - سوچیت سنگھ

ضمیمہ نمبر ۲

معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء

دفعہ اوّل

حکومت برطانیہ وہ تمام کوہستانی علاقہ (مع ملحقات آں) جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع ہے (بشمول چمبہ و باستثنائے لاہول) اور جو اس علاقے کا ایک حصہ ہے۔ جو حکومت لاہور نے معاہدہ لاہور مورخہ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کی دفعہ ۴ کے منشا کے ماتحت حکومت برطانیہ کے سپرد کر رکھا ہے، مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے جبلی مذکر وارثوں کے خود مختار قبضہ میں منتقل کرتی ہے۔

دفعہ دوم

جو علاقہ دفعہ اوّل کے مطابق مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضہ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کی مشرقی سرحد کا فیصلہ وہ کمشنر کریں گے جنہیں حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ اس مقصد کے لئے مقرر کریں گے اور یہ سرحد بعد پیمائش و مساحت ایک علیحدہ دستاویز میں معین کی جائے گی۔

دفعہ سوم

دفعات مندرجہ بالا کے منشا کے ماتحت جو علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں کے نام منتقل کیا جارہا ہے۔ اس کے عوض میں مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کو پچھتر لاکھ روپیہ (نانک شاہی) ادا کریں گے۔ جس میں سے پچاس لاکھ تو اس معاہدے کی تصدیق پر دیا جائے گا اور باقی پچیس لاکھ سالِ رواں ۱۸۴۶ء کی یکم اکتوبر کو یا اس سے پیشتر ادا کیا جائیگا۔

دفعہ چہارم

مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقوں کی حدود کسی وقت بھی حکومت برطانیہ کی منظوری کے بغیر تبدیل نہ کی جائیں گی۔

دفعہ پنجم

اگر مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت لاہور یا کسی اور ہمسایہ سلطنت کے درمیان کوئی جھگڑا یا مسئلہ پیدا ہوگا تو مہاراجہ اس کو حکومت برطانیہ کی ثالثی کے سپرد کرے گا اور حکومت برطانیہ کے فیصلہ کا پابند ہوگا۔

دفعہ ششم

مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی اور اپنے وارثوں کی طرف سے عہد کرتے ہیں کہ اگر کبھی برطانوی فوج ان کے مقبوضہ ملک کے ملحقہ علاقے یا کوہستان میں

مصروف کار ہوگی تو وہ اپنی ساری فوج سمیت برطانوی فوج کے ساتھ شامل ہونگے

دفعہ ہفتم

مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں۔ کہ حکومت برطانیہ کی منظوری کے بغیر وہ برطانیہ یا کسی یورپی یا امریکی سلطنت کی رعایا کے کسی آدمی کو اپنے ماتحت ملازم نہ رکھیں گے۔

دفعہ ہشتم

مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ جہاں تک ان کے حق میں منتقل ہونے والے علاقوں کا تعلق ہے۔ وہ حکومت برطانیہ اور دربارِ لاہور کے درمیان علیحدہ معاہدہ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ء کی دفعات ۵۔ ۶۔ ۷ کے منشا کا احترام کریں گے۔

دفعہ نہم

حکومت برطانیہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقوں کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں امداد بہم پہنچائے گی۔

دفعہ دہم

مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور اس تسلیم کی نشانی کے طور پر حکومت برطانیہ کی خدمت میں ہر سال ایک گھوڑا، اچھی نسل کی بارہ پشمی بکریاں (چھ بکرے اور چھ بکریاں) اور تین جوڑی کشمیری دوشالوں کی پیش کیا کریں گے۔

یہ معاہدہ جو دس دفعات پر مشتمل ہے۔ آج حکومت برطانیہ

کی جانب سے ۔ رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی، سی، بی ۔ گورنر
جنرل کی زیر ہدایت فریڈرک کری صاحب ۔ بریوٹ میجر ہنری لارنس
اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان قرار پایا ۔

اس مذکورہ معاہدہ کی آج رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ
جی، سی، بی گورنر جنرل کی مہر ثبت کرتے ہوئے تصدیق کی گئی ۔

قرار یافتہ بمقام امرتسر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء مطابق ۱۷ ربیع الاول
۱۲۶۲ھ ۔

دستخط
ایچ ہارڈنگ
ایف کری
ایچ ۔ ایم لارنس

دستخط
گلاب سنگھ

ضمیمہ نمبر ۲-الف

۷۵ لاکھ روپے کی آخری رسید

مہاراجہ گلاب سنگھ کو ۷۵ لاکھ روپے کی ادائیگی پر جو آخری رسید دی گئی۔ اُس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:۔

آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہز ہائی نس مہاراجہ گلاب سنگھ سے ۷۵۰۰۰۰۰/- (پچھتر لاکھ روپے) جن کی ادائیگی کا اقرار اس معاہدہ کی دفعہ ۳ کے تحت کیا گیا تھا۔ جو آنریبل کمپنی اور ہز ہائی نس کے درمیان بمقام امرتسر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو قرار پایا تھا۔ وصول پائے۔ کل رقم وصول شدہ کی یہ واحد رسید دیوان جوالا سہائے کی درخواست پر مسائل پنجاب کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے ان رسیدات کے علاوہ دی جا رہی ہے کہ جو مہاراجہ کے کارندوں کو تاریخ معاہدہ سے ۱۴ مارچ ۱۸۵۰ء تک کے درمیانی عرصہ میں اقساط کے خزانہ لاہور میں جمع کرنے پر دی جاتی رہی ہیں۔

ایچ - ایم لارنس
جان لارنس
سی - ای - منسل

لاہور
۲۹ مارچ ۱۸۵۰ء

ضمیمہ نمبر ۳

بالتستان۔ لداخ۔ گلگت

بالتستان

بالتستان کے شمال میں ریاست نگر، مشرق میں لداخ جنوب میں کشمیر اور مغرب میں گلگت ہے۔ علاقہ پہاڑی ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں ۲۵ ہزار سے ۲۸ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہیں۔ بالتستان کے ابتدائی حکمران گیالپوس کہلاتے تھے۔ صدیوں سے یہاں مسلمان آباد ہیں اور حکمران خاندان اپنے آپ کو کسی فقیر کی اولاد ظاہر کرتے تھے۔ اس خاندان کے حکمران راجہ علی شیر نے جو سولھویں صدی کے آخیر میں گذرا۔ لداخ کو فتح کرتے ہوئے اسکارڈو میں ایک قلعہ تعمیر کرایا جسے بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہوئی۔ اور اس وقت تک یہ قلعہ سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔

اس خاندان کا آخری حکمران احمد شاہ تھا۔ جس نے گلاب سنگھ کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شکست کھائی۔ اس طرح اس علاقہ پر کشمیر کی سیادت قائم ہوئی آبادی تمامتر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

لداخ

لداخ کشمیر کے مغرب میں پہاڑی علاقہ ہے۔ جو سلسلہ کوہ ہمالیہ اور کوئیون۔ بالتستان اور چینی تبت کے درمیان واقع ہے۔ یہ علاقہ حقیقتاً تبت ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے عام طور "چھوٹا تبت" کہتے ہیں۔

سترھویں صدی میں بالتستان کے باشندوں نے اس علاقہ پر متعدد حملے کئے۔ کبھی فتحیاب ہوئے تو کبھی شکست کھا کر واپس لوٹ آئے۔ پھر اسی سترھویں صدی کے اواخر میں مغلوں کے ایک قبیلہ نے باشندگانِ لداخ کو پریشان کرنا شروع کیا جس سے تنگ آکر انہوں نے دربارِ کشمیر سے امداد طلب کی۔ چنانچہ امداد دی گئی اور اس طرح لداخ کے علاقہ پر حکومت کی سیادت قائم ہو گئی۔

علاقہ پہاڑی ہے اور اس کی سطح ۹ ہزار سے ۱۷ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہے۔ ابتداءً اس علاقہ کا ذکر مشہور چینی سیاح فاہین نے سنہ ۴۰۰ء اور پھر کوئی چار سو سال بعد ہیون سانگ نے ساتویں صدی عیسوی میں کیا تھا۔

یہاں کی آبادی کلیتہً بدھ مت کے پیروؤں پر مشتمل ہے۔ البعض بعض علاقوں میں مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں کوئی ۴۲۳ گاؤں آباد ہیں۔

گلگت

گلگت دنیا کے بلند ترین حصوں میں شمار ہوتا ہے۔ ابتدائی ہندو راج میں اسے "سارگن" کے نام سے پکارا جاتا

تھا۔ بعد میں یہ علاقہ گلت پکارا جانے لگا۔ لیکن جب سکھ اور ڈوگرہ اسطرف پہنچے تو انہوں نے لفظ گلت کو بگاڑ کر "گلگت" کر دیا۔ اور اب اسی نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ مقامی لوگ اب بھی اسے "سارگن" یا "سارگن گلت" ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ علاقہ کلیتہً پہاڑی ہے جس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۶۵ میل کے رقبہ میں جو پہاڑی چوٹیاں ہیں ان میں گیارہ کی بلندی ۱۸ سے ۲۰ ہزار۔ سات کی ۲۰ سے ۲۲ ہزار۔ چھ کی ۲۲ سے ۲۴ ہزار اور آٹھ کی ۲۴ سے ۲۶۶۰۰ فٹ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں بدھ اور ہندو اپنا عہدِ عروج گذار چکے ہیں۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آخری ہندو راجہ کا نام سری بدت تھا۔ جسے "آدم خور" کہتے تھے۔ اس آدم خور کو ایک مسلمان سیاح نے قتل کرتے ہوئے ایک مسلم حکمران خاندان کی بنیاد ڈال دی۔ جو "تراخان" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد صدیوں سے مسلمان اس علاقے میں آباد ہیں۔ اور آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آدم خور کی حکومت کو چترال تک وسعت حاصل تھی۔ جو اس کے قتل کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں "لیسین" کے حکمران نے گلگت کو فتح کر لیا۔ لیکن نیپال کے حکمران نے اس فاتح کو قتل کر دیا۔ بعد میں اس حکمران کو نگرہ کے فرمانروا طاہر شاہ نے مار ڈالا۔

اس طرح کوئی تین سو سال قبل سکارڈو میں ایک ایرانی سیاح میچن نے وہاں کے شاہی خاندان میں شادی کر لی۔ بعد میں اس سیاح کے چار بیٹے چار علاقوں یعنی سکارڈو۔ آستور۔ ڈونڈو اور خرمنگ کے حکمران بنے

سکھوں نے اپنے عہد حکومت کی ابتداء ہی میں گلگت کی طرف لشکرکشی کی۔ لیکن گلگت سے کوئی ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہنزہ اور نگر کے باشندوں نے مقابلہ کیا اور بقول کرنل ڈیورنڈ اس لشکر کے بارہ سو افراد میں سے کچھ موت کے گھاٹ اتارے گئے اور کچھ زندہ گرفتار ہو کر غلام بنے۔

بعد میں باہم خانہ جنگی نے ملک کی حالت برباد کر دی جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے راجہ گلاب سنگھ نے اس طرف یورش کی۔ پھر انگریزوں کو اس علاقہ کی فکر دامنگیر ہوئی۔ تو انہوں نے وہاں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔ اور ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ بھی بنا لیا گیا۔

گلگت کے علاقہ میں کوئی ۲۶۴ گاؤں آباد ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۴

ریاستہائے حنزہ اور نگر

حنزہ اور نگر کی ریاستیں کشمیر کے شمال مغرب میں واقع ہیں اور ان کا رقبہ بالترتیب ۶۰۴۵ اور ۱۲۴۲ مربع میل ہے۔ دونوں ریاستوں کے باشندے ایک ہی قوم و نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں، لیکن دونوں میں دوستی شاذ ہی دیکھی جاتی ہے۔ حنزہ، نگر اور گلگت کا درمیانی قلعہ "چلت" ابتداء ہی سے وجہ مخاصمت چلا آیا ہے۔ اس کے حصول کے لئے دونوں ریاستیں اکثر آپس میں برسرپیکار رہیں ۱۸۶۶ء میں والئے نگر نے دربار کشمیر سے امداد حاصل کرتے ہوئے چلت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس وقت سے لیکر ۱۸۸۶ء تک چلت اور چپروت پر نگر اور کشمیر کے لشکر قابض رہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ انگریز اس علاقہ میں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی ۱۸۸۶ء میں

کرنل لاکھارٹ (COL. LOCKHART) ایک مشن لے کر ہنزہ پہنچے۔ تو والئے ہنزہ نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا جس پر کرنل لاک ہارٹ نے والئے نگر کو چلت سے اپنا لشکر واپس بُلا لینے پر رضامند کر لیا اور علاقہ پر صرف دربارِ کشمیر کا تسلط قائم ہو گیا۔ اور ۱۹۰۰ء تک یہی حالت قائم رہی۔

۱۸۸۶ء میں ہی والئے ہنزہ غزن خان اپنے بیٹے صفدر علی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تو صفدر علی نے نگر کے مقابل اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لئے دربارِ کشمیر کی سیادت قبول کر لی۔ لیکن جب بعد میں ہنزہ اور نگر کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تو دونوں نے ملکر چلت اور چپروت سے کشمیری لشکر کو مار بھگایا۔ دربارِ کشمیر کو مزید فوج بھیجنا پڑی۔ جس نے جاکر دوبارہ ان مقامات پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے گلگت میں ایجنسی قائم کر دی تو ہنزہ اور نگر کے حکمرانوں سے اقرار لے لیا گیا۔ کہ ان کے علاقوں سے یارقند اور دوسرے علاقوں میں کسی قسم دراز دستی نہ کی جائے گی۔ اور پُرامن رہنے کے لئے ہر دو حکمرانوں کو دو دو ہزار روپے سالانہ دئے جانے لگے۔ ۱۸۹۱ء میں پھر دونوں ریاستوں نے مل کر چلت اور چپروت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اسی دوران میں انگریزوں نے چلت تک سڑک تعمیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن دونوں ریاستیں آمادہ نہ ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ہوئی اور دونوں ریاستوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ظفر زاہد خان

والیٔ نگر نے تو اطاعت قبول کر لی۔ لیکن صفدر علی والیٔ ہنزہ بھاگ کر چینی ترکستان کی طرف چلا گیا۔ اور وہیں ۱۹۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔ دونوں ریاستوں کی مالی امداد بند کر دی گئی اور ہنزہ میں ایک پولیٹیکل افسر مقرر کر دیا گیا۔ تاکہ وہ نظم و نسق کو چلاتا رہے۔

۱۵ ستمبر ۱۸۹۲ء کو صفدر علی کے ایک سوتیلے بھائی ناظم خان کو برطانوی ایجنٹ نے والیٔ ہنزہ مقرر کر دیا۔ تو ۲۲ ستمبر ۱۸۹۲ء کے دن ظفر زاہد خان کو باقاعدہ والیٔ نگر تسلیم کر لیا گیا۔ پھر ۱۸۹۵ء سے ہر دو ریاستوں کو چار چار ہزار روپے سالانہ دئیے جانے لگے۔ (اس رقم کا نصف حکومتِ ہند ادا کرتی رہی اور نصف دربار کشمیر)

ریاست ہنزہ کے ساتھ چینی سرحد ملتی ہے۔ والیٔ ہنزہ واسکم اور تاغ دمباش کے علاقوں پر اپنی سیادت کا دعویٰ کرتا رہا ہے۔ اس وجہ سے اسے اجازت دے دی گئی تھی۔ کہ وہ کاشغر کے چینی حکام سے تحائف کا تبادلہ کرتا رہے۔ ۱۸۹۹ء میں چینی حکام نے مذکورہ علاقوں میں ہنزہ کے باشندوں کے حق کاشت کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ والیٔ ہنزہ اپنے دعویٰ سے دست بردار نہ ہو سکا۔ اور ۱۹۱۴ء میں پھر باشندگانِ ہنزہ کو ان علاقوں میں آباد کر دیا گیا اور اس وقت سے یہ لوگ وہاں آباد ہیں۔

یہ دونوں ریاستیں اپنے اندرونی نظام میں کلیتہً آزاد ہیں۔ البتہ دونوں نے کشمیر کی سیادت قبول کر رکھی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ریاست

ہنزہ ۱۶ تولے ۵ ماشے اور ریاست نگر ۱۰ تولے ایک ماشہ سونا ہر سال دربارِ کشمیر کو بطور نذرانہ پیش کرتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ریاست ہنزہ حکومتِ چین کو بھی پونے پانچ تولے سونا بطور نذرانہ ہر سال ادا کرتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہر دو ریاستوں نے کشمیر کی سیادت کا جوا اتار پھینکا۔ اور پاکستان سے الحاق کر لینے کے اعلان کے ساتھ کشمیر کی آزاد حکومت کی امداد و اعانت میں مصروف ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۵

پونچھ

معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء کے تحت پونچھ کا علاقہ بھی مہاراجہ گلاب سنگھ کے تصرف میں دے دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں مہاراجہ نے یہ علاقہ بطور جاگیر جواہر سنگھ اور موتی سنگھ پسران دھیان سنگھ کے حوالہ کر دیا کہ جو ابتداءً اس کی ملکیت کے دعویدار تھے۔ (شجرۂ نسب کیلئے دیکھو ضمیمہ ۱) کوئی دو سال بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ان دونوں بھائیوں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ جسے ایک انگریز افسر سر ایف۔ کیوری (F. CURRIE) نے ثالث بالخیر بن کر ختم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر سنگھ اور موتی سنگھ کو جو اس وقت تک "میاں" کہلاتے تھے۔ مہاراجہ نے "راجہ" کا خطاب دے دیا۔ کچھ دیگر مراعات بھی دیں۔ اس کے جواب میں دونوں بھائیوں نے مہاراجہ کی سیادت تسلیم کرتے ہوئے سالانہ ایک گھوڑا مع زین مرصع یا سات سو روپے نقد دینے کا اقرار کیا۔

۱۸۵۲ء میں پونچھ کے یہ دو راجے آپس میں جھگڑنے لگے جس پہ انگریز

نے مداخلت کی۔ پونچھ کا تمام علاقہ موتی سنگھ کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور اُسے ہدایت کی گئی کہ وہ متذکرہ سات سو روپے کے نذرانہ کا نیسر حصہ ادا کرے۔ جواہر سنگھ کو اپنی جاگیر سے محروم کر دیا گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ بالآخر ۱۸۵۹ء میں اُس نے اپنے حقوق سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ تو مہاراجہ نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا لیکن اس کے کوئی ایک سال بعد ۱۸۶۰ء میں وہ انتقال کر گیا۔

۱۸۹۲ء میں موتی سنگھ کے انتقال پر اس کا بیٹا بلدیو سنگھ جاگیر دار بنا۔ ۱۹۰۹ء میں اُسے دربارِ انگلشیہ سے "کے۔ سی۔ آئی۔ ای" کا خطاب ملا۔ اور اوّل جنگِ یورپ میں بھرتی دینے کے صلہ میں اُسے ۱۹۱۶ء میں "میجر" بنا دیا گیا۔ اور ۱۹۱۸ء میں اعترافِ خدمات کے طور اُسے ذاتی حیثیت سے ۹ توپوں کی سلامی لینے کا اعزاز عطا ہوا۔

ستمبر ۱۹۱۸ء میں اس راجہ نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا راجہ سکھدیو سنگھ جاگیر دار بنا۔ اس نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا تو جاگیر اس کے بھائی جگت دیو سنگھ کے ہاتھ لگی۔

راجہ پونچھ دربارِ کشمیر کو ۲۳۱ روپے سالانہ بطور نذرانہ پیش کرتا ہے۔

حاجی محمد یوسف کے زیرِ اہتمام
اسلامیہ پریس کوئٹہ میں چھپی!